بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد نمبر ۸۱　ماہ مارچ ۲۰۱۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ　شمارہ نمبر ۳

مدیر
خلیل الرحمان سجاد نعمانی
E-mail : ilm.zikr@yahoo.com

اس شمارہ میں

	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	(نگاہ اولیں) ا ۔ آہ! مولانا عبد اللہ حسنی ندوی علیہ الرحمہ ب ۔ مولانا ڈاکٹر شمس تبریز قاسمی مرحوم	مدیر مولانا محمد زکریا سنبھلی	۳
۲	محفل قرآن	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	۲۰
۳	میاں بیوی کی جذباتی ضروریات	حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی	۲۷
۴	مسئلۂ تقلید اور اس موضوع پر ایک نئی کتاب	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۳۷
۵	ایک عجیب وغریب تضاد.....	مولانا محمد الحسنی مرحوم	۴۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ
آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ
بصیغۂ V.P. ارسال کیا جائے گا جس میں آپ کے -/35 روپے زائد خرچ ہوں گے ــــ منیجر

ضروری اعلان

مختلف مقامات میں ماہنامہ الفرقان کی توسیع اشاعت کے واسطے حضرات کے نام اور فون نمبر نیچے لکھے جا رہے ہیں ان مقامات نیز قرب و جوار کے حضرات ان سے رابطہ قائم کریں۔

مقام	نام	فون نمبر
۱۔بڑودہ (گجرات)	مفتی محمد سلمان صاحب	+91-9898610513
۲۔مالیگاؤں (مہاراشٹرا)	مفتی حسنین محفوظ صاحب	+91-9226876589
۳۔بیلگام (کرناٹک)	مولانا تنویر صاحب	+91-9880482120
۴۔بیڑ (مہاراشٹرا)	قاسمی بکڈپو طہٰ بکڈپو الطاف بکڈپو	+91-9960070028 +91-9326401086 +91-9325052414-9764441005
۵۔گورکھپور (اترپردیش)	مکتبہ ناصر	+91-9451846364
۶۔جالنا (مہاراشٹرا)	محمد اظہر	+91-9225715159

مرتب: یحییٰ نعمانی

ناظم شعبۂ رابطہ عامہ : بلال سجاد نعمانی
E-mail: nomani_sajjadbilal@yahoo.com

☆ سالانہ زر تعاون، برائے ہندوستان: (سادہ ڈاک) عمومی -/Rs.200

☆ سالانہ زر تعاون برائے ہندوستان: (بذریعہ وی پی [1]) عمومی -/Rs.230

[1] اس صورت میں پہلے سے زر تعاون بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ رسالہ وصول کرتے وقت ڈاکیہ کو مطلوبہ رقم ادا کرنی ہوتی ہے،
مگر خیال رہے کہ وی پی نہ وصول ہوئی تو ادارہ کو -/Rs.40 کا نقصان ہوتا ہے

☆ سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک (بذریعہ ہوائی جہاز) -/20 پاؤنڈ۔ -/40 ڈالر

لائف ممبرشپ: ہندوستان: سادہ ڈاک -/Rs.8000۔

بیرونی ممالک: -/600 پاؤنڈ۔ -/1200 ڈالر۔

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ : Mr. RAZIUR RAHMAN
90-B HANLEY ROAD. LONDON N4 3DW U.K
Fax & Phone:020 72721352. Email:furqanpublications@googlemail.com

ادارہ کا مضمون نگار کی فکر سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ الفرقان
۱۱۴/۳۱ نظیر آباد لکھنؤ۔
پن-۲۲۶۰۱۸- یوپی، انڈیا- فون نمبر: Ph:0522-4079758

MonthlyALFURQAN
114/31, NAZIRABAD LUCKNOW
Pin-226018- U.P INDIA
e-mail : monthlyalfurqanlko@gmail.com

دفتر کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے ۱ بجکر ۳۰ منٹ بعد ظہر: ۲ بجے سے ۵ بجکر ۳۰ منٹ تک
اتوار کو آفس بند رہتا ہے۔۔۔۔۔

خلیل الرحمن سجاد کے لئے پرنٹر پبلیشر محمد حسان نعمانی نے کاکوری آفسیٹ پریس کچہری روڈ لکھنؤ میں چھپا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اولیں

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(الف)

آہ! مولانا عبداللہ حسنی ندوی (علیہ الرحمۃ)

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

۳۰/جنوری کی صبح گیارہ بجے کے قریب، بھٹکل[1] جانے کے ارادے سے ریلوے اسٹیشن پر اترا، اور وہاں سے آئے ہوئے علماء کرام اور عزیز دوستوں کے ساتھ بھٹکل کے لئے ہمارا چھوٹا سا قافلہ کاروں میں روانہ ہوا، مہمان اور میزبان سب ہی اس ملاقات پر بے حد خوش تھے، کہ اچانک عزیز القدر مولوی محمد الیاس ندوی نے کسی سے فون پر خبر سننے کے بعد بتایا کہ ابھی چند منٹ پہلے مولانا عبداللہ حسنی اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ سب کی زبان سے نکلا: **انا للہ وانا الیہ راجعون** —— اور پورے ماحول پر سناٹا چھا گیا، ہر ایک سکتے کے عالم میں تھا، اور دعا ورجوع الی اللہ میں ماسوا سے منقطع، **اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وأدخلہ الجنۃ ونجہ من النار، اللھم تقبل حسناتہ وتجاوز عن سیئاتہ، اللھم اعف عنہ وعافہ واکرم نزلہ ووسّع مدخلہ، اللھم لاتحرمنا خیرہ ولاتفتنا بعدہ۔**

مولانا عبداللہ حسنی کچھ عرصے بیمار تھے، مرض کی نوعیت بھی سنگین بتائی جاتی تھی، لیکن شاید کسی کو بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ ہم سے جدا ہوجائیں گے —— جنوری کے پہلے ہفتے میں یہ راقم الحروف ۷۔۸ دن لکھنؤ میں رہا، مولانا کی علالت کی خبر سن کر عیادت کے لئے جانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ لوگوں

[1] بھٹکل جنوبی ہندوستان کا ایک ساحلی شہر ہے۔ اس شہر کے مسلمان اپنی زندہ دلی۔ اجتماعیت اور دین و دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کے سلسلے میں ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ یہاں کا جامعہ اسلامیہ ندوۃ العلماء کا ''مثنّٰی'' ہے۔

سے ملاقات آج کل مولانا کے لئے اذیت ہی کا باعث بنتی ہے، تو نہ جانا اور دعا پر اکتفاء کرنا ہی بہتر سمجھا۔

مولانا عبداللہ حسنی برصغیر کے اس نہایت برگزیدہ اور عالی نسب خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس میں شاید ہر دور میں دعوت وعزیمت کی تاریخ رقم کرنے والے عظیم علماء ربانیین پیدا ہوئے، ان کے جدامجد حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (رحمهما الله) سے کون پڑھا لکھا مسلمان ناواقف ہے —— حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں تو کچھ بھی عرض کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم ان کے بڑے بھائی اور ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کے دادا حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے بارے میں اتنا عرض کرنا مناسب ہوگا کہ وہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور علامہ انور شاہ کشمیری کے تلمیذ رشید تھے، شیخ الہند سے انھوں نے ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں صحیح بخاری اور سنن ترمذی پڑھی تھی، اور علامہ کشمیری سے سنن ابی داؤد۔ بیعت وارادت کا تعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ سے تھا، اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی بھی شفقت وتوجہ خاص انھیں حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ تشریف آوری کے موقع پر حضرت تھانویؒ کی مجالس میں بڑے اہتمام سے شرکت فرماتے تھے، حضرت تھانوی بھی ان کے مکان پر خود تقاضا کر کے تشریف لے گئے تھے بلکہ اسی موقع پر ان کے صاحبزادے محمد الحسنی (جو اُس وقت ۳۔۴ سال کے تھے اور جو بعد میں ہمارے ممدوح مولانا عبداللہ حسنی کے والد بنے) کی بسم اللہ کرائی۔ اسی طرح حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کو بھی ان سے خصوصی تعلق خاطر تھا، امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ سے بھی گہرا تعلق تھا، اور ڈاکٹر صاحب ان کے اخلاص وللّٰہیت کے بے حد معترف رہا کرتے تھے —— حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے بھی ان کو گہری عقیدت ومحبت تھی، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سفروں کے عادی نہیں تھے، مگر اس کے باوجود حضرت مولانا الیاس کی ملاقات اور ان کی صحبت میں چند دن گذارنے کے ارادے سے نظام الدین تشریف لے گئے —— اور جب رخصت ہونے لگے تو حضرت مولانا الیاسؒ نے یہ شعر پڑھا تھا[۱]

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد　　　روئے گل سیر ندیم وبہار آخر شد

یہ ساری تفصیل صرف یہ بتانے کی غرض سے لکھی ہے کہ ہمارے نوجوان طلبہ اور نو واردان بساطِ علم

۱۔ الفرقان: فروری ومارچ ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ پر ایک مضمون مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کا شائع ہوا تھا، یہ سب معلومات اسی مضمون سے ماخوذ ہیں۔

کو خاص طور پر یہ معلوم ہو کہ خانوادۂ حسنی کی ایک بہت بڑی صفت اہل اللہ کی قدر، ان کا ادب واحترام، اور ہر طرح کی عصبیت اور تحزب سے دور رہتے ہوئے اپنے کو بڑوں کا چھوٹا تسلیم کرنا اور کھلے دل سے سب سے استفادہ کرنا ہے ——— یہ راقم سطور گواہی دیتا ہے کہ بڑوں کا تو ذکر ہی کیا چشم بددور! ابھی تک اس خانوادے کے نوجوانوں میں بھی یہ ذوق دوسرے بہت سے خاندانوں کی بہ نسبت سلامت بلکہ نمایاں نظر آتا ہے اور شاید یہی اِس خانوادے کے اقبال کا اصل سبب ہے ..... اللہ سدا اقبال بلند رکھے ——— ماننے والے جانتے ہیں کہ بزرگوں کا احترام اور ان کی دلی قدر ومحبت کس قدر مفید ہوتی ہے اور ان کی تنقیص وتنقید کا ذوق بلکہ چسکا کس درجہ تباہ کن اور ہلاکت خیز!!

یہ تو ہوا مختصر سا تذکرہ مولانا عبداللہ حسنی کے جدامجد حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کا، جہاں تک ان کے عظیم والدگرامی مولانا محمد الحسنی کا تعلق ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں ان کے انتقال کے بعد صاحب الفرقان (ہمارے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ) نے جو مضمون لکھا تھا وہ پورا مضمون ذیل میں نقل کر دیا جائے ——— اس لئے کہ ہمارے موجودہ قارئین میں زیادہ تر وہ ہوں گے جن کی نظر سے وہ مضمون نہیں گذرا ہوگا، اور جو پڑھ بھی چکے ہوں گے وہ بھی اسے بھول چکے ہوں گے، ——— فرقان: جولائی ۱۹۷۹ء کے ''نگاہ اولیں'' میں ''مولانا محمد الحسنی، مدیر البعث الاسلامی الی رحمۃ اللہ'' کے زیر عنوان انھوں نے لکھا تھا:

> ''اکثر ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے حقیقی بھتیجے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرۂ آفاق عربی جریدہ ''البعث الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمد الحسنی جو اپنی بعض خداداد خصوصیات اور وہبی کمالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ سال کی تھی.... صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھا لئے گئے ——— ان للہ ما اخذ ولہ ما أعطی وکل شیء عندہ بأجل مسمّٰی۔
>
> دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری، مولانا علی میاں کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ ''رجلٌ موھوبٌ'' (یعنی ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کسبی نہیں، وہبی ہے، انھوں نے محنت کر کے حاصل نہیں کیا، اللہ تعالی نے اپنے خزانۂ کرم سے یوں ہی عطا فرما دیا ہے) ——— واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مولانا علی میاں سے کہیں زیادہ ان

کے مرحوم بھتیجے مولانا محمد الحسنی پر صادق آتی ہے۔

اب سے ۳۳ سال پہلے ۱۹۷۹ء کی بات ہے جب یہ راقم سطور مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ ان ہی کی تحریک پر ''الفرقان'' کو بریلی سے لکھنؤ منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لئے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اور ان کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی (علیہ الرحمۃ) کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا۔ عزیز موحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے، ان کو سب ''محمد میاں'' کہتے تھے، اس وقت وہ ۱۰ سال کے بچے تھے لیکن میں نے ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا تھا، بولتے بھی بہت ہی کم تھے ——— دریافت کرنے معلوم ہوا تھا کہ یہ پڑھنے کے لئے کسی اسکول یا مکتب مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں، والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک باترجمہ پڑھاتے ہیں اور اسی کے ذریعہ عربی تعلیم بھی ہو رہی ہے اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا مطالعہ بھی کراتے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف ونحو کی کوئی کتاب ان کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے کا ارادہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد سنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں ——— ہم جیسوں کو بجا طور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف ونحو بالکل نہیں پڑھی، جو ماضی، مضارع، معرب، مبنی، مرفوع، منصوب، مجرور، منصرف، غیر منصرف کو نہیں جانتا وہ عربی کا کوئی جملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے ——— لیکن اللہ کی شان اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کہ محمد میاں صرف ونحو سے بالکل ناواقف اور نابلد ہونے کے باوجود بہت ہی اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے اور ان رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالباً یہ سمجھ کے شائع کئے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ ''المسلمون'' میں شائع ہوا تھا، جو اس زمانے میں دمشق سے نکلتا تھا، اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی موقر مجلہ تھا۔

پھر ان کی عمر کا ۲۰ واں سال تھا کہ انھوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ''البعث الاسلامی'' کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہو گیا۔ اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، اُن کا گھر ہی اُس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لئے مضامین

لکھتے، خود ہی کتابت کراتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اس کو روانہ کرنے کا اہتمام کرتے ''خوکوزۂ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ''۔

راقم سطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی ذات کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارے کا سودا تھا، لیکن اللہ تعالی نے ۲۰ سالہ محمد میاں کو یہ ہمت بخشی ——— جلد ہی ''البعث الاسلامی'' عربی ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا———

پھر ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں (جس میں راقم سطور بھی بحیثیت رکن شریک تھا) اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ ''البعث الاسلامی'' کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے اور اس کی اشاعت کا اہتمام وانتظام ندوۃ العلماء کی طرف سے ہو، اور مولانا محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوہ اور اس کے دار العلوم کے لئے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لئے بہت مفید ہوگا۔

غور وفکر کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ نے (جو ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) اس کی منظوری دے دی اور ''البعث الاسلامی'' کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف منتقل ہوگئی۔ کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہ آیا، بلکہ مولانا محمد میاں کے لئے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاونس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کرکے اس کا کام کرتے رہے اور اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

قریبا دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لئے ''البعث الاسلامی'' کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف سو ۱۰۰ روپے کا الاؤنس منظور کیا گیا، انھوں نے اس کو بھی بخوشی قبول کرلیا حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے دفتر کے بعض محرروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی، اللہ تعالی نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنا دیا تھا لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالی کی طرف سے اس کی شان عالی کے مطابق ملا اور البعث الاسلامی ہی کے سلسلہ میں ان کے لئے ''یرزقه من حیث لا یحتسب'' کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا وہ عربی زبان کی صرف ونحو سے بالکل ناواقف تھے (راقم سطور نے خود مولانا علی میاں سے سنا ہے کہ غالباً ان کو ماضی کی پوری گردان بھی یاد نہ ہوگی) لیکن ''البعث الاسلامی'' میں ان کی جو تحریریں شائع ہوتی تھیں وہ زبان کے لحاظ سے عالم عربی کے مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے ہم پلہ ہوتی تھیں، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''الاسلام الممتحن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کو دیکھ کر آج بھی ہر وہ شخص جس میں اس کی اہلیت ہو یہ موازنہ کرسکتا ہے۔

وہ زبان واسلوب میں (عربی میں بھی اور اردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا تتبع کرتے تھے کہ گویا ان کا مثنّٰی اور ''دوسری کاپی'' بن گئے تھے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس واندازاس باب میں معتبر ہوسکتا ہے محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریر میں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آ گئی ہے، خود مولانا علی میاں بھی کبھی کبھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔

ان کا شاہکار اور آخری یادگار:

۱۱ جون دوشنبہ کی شام کو اسی مہینہ جون (مطابق رجب) کا ''البعث الاسلامی'' کا شمارہ میرے پاس آیا، مغرب وعشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا جو عزیز مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا ''سوال حائر یحتاج الی جواب'' یہ ۷ صفحے کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صاف صاف کہا جانا ان کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا اور از روئے دین اب فرض ہو گیا تھا اور اس فرض کو اب وہی مرد خدا ادا کرسکتا تھا جس کو اللہ تعالی کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو۔ اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالی کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسنی کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور مؤثر سے مؤثر انداز میں انھوں نے یہ فرض ادا کر دیا، میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے ''ندائے غیب'' سمجھا اور طے کرلیا کہ اس کو اردو میں منتقل کر کے ''الفرقان'' میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲ جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا، ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تأثر ان کو بتلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی زیادہ سے

زیادہ بس دو تین دن میں ''الفرقان'' کے لئے اردو میں منتقل کر دیں یا کسی سے کرا دیں، انھوں نے کہا بہت اچھا! انشاء اللہ ہو جائے گا[1] اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہوگا کہ آج ہی کا دن ان کی زندگی اور ان کے کام کا آخری دن ہے اور کل ہی ان کا سفر آخرت ہے۔

اس کے اگلے دن (۱۳ جون چہار شنبہ کو) انھوں نے پیٹ میں کچھ تکلیف اور نفخ کی سی کیفیت محسوس کی جس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی گئی، یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کو بھی (جو عزیزوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں) بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، بس فون پر حال کہہ دیا گیا، انھوں نے دوا بتلا دی، وہ دوا استعمال کی گئی، جب اس سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوا تو حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی کی طرف رجوع کیا گیا، جن کا مطب بالکل قریب ہی ہے اور جن سے ہم خاندانی جیسا تعلق ہے، انھوں نے نسخہ تجویز فرما دیا، اس کے استعمال سے بھی تکلیف میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی، پھر ایک ایلوپیتھ ڈاکٹر کو بلایا گیا، انھوں نے دوا دی اور ایک انجکشن تجویز کیا جو لگوایا گیا، لیکن تکلیف میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ برابر اضافہ ہی ہوتا رہا، سہ پہر کو ڈاکٹر قریشی صاحب کو پھر فون ہی سے حال بتلایا گیا، وہ عصر کے وقت خود تشریف لائے اور صورت حال دیکھ کر انھوں نے طے کیا کہ ان کو اسپتال میں داخل کر دیا جائے، ڈاکٹر صاحب خود اپنی گاڑی سے ان کو اسپتال لے گئے، یہ ۱۳ جون بعد مغرب کا وقت تھا، راقم سطور کو اس وقت تک بھی ان کی اس علالت کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی، جب وہ اسپتال لے جائے گئے تو ان کے خلف الصدق مولانا عبداللہ سلمہ اللہ تقریباً آٹھ بجے میرے پاس آئے، انھوں نے اطلاع دی، اس وقت مجھے علم ہوا، مولانا علی میاں قریباً دو ہفتے سے سفر میں تھے اور وہ دن ان کے بمبئی میں قیام کا تھا، مولوی عبداللہ سلمہ اللہ تعالی نے یہ بھی کہا کہ ہمارا فون کام نہیں کر رہا ہے، آپ ہی مولانا کو بمبئی اطلاع دے دیں، حسن اتفاق کہ اس وقت صرف ۱۵ منٹ میں فون کے ذریعہ بمبئی سے رابطہ قائم ہو گیا اور مولانا کو علالت کی اطلاع دے دی گئی، ادھر یہ ہوا کہ اسپتال میں پہنچنے کے قریباً ایک گھنٹے کے بعد عزیز مرحوم کا وقت موعود آ گیا اور وہ ہم سب کو الوداع کہہ کے اپنے غفور رحیم رب کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت ان کی عمر کا چوالیسواں سال تھا۔

اخیر شب میں ان کو غسل دیا گیا، جنازہ کی نماز صبح طلوع آفتاب کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھی گئی اور تدفین کے لئے جنازہ اسی وقت رائے بریلی کے لئے روانہ ہو گیا، وہاں پہنچ کر دوبارہ

[1] انشاء اللہ آپ یہ مضمون اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

نماز پڑھی گئی اور ۱۱۔۱۲ بجے کے درمیان تکیہ شاہ علم اللہ میں اپنے والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب علیہ الرحمۃ کے پہلو میں دفن کردئے گئے۔ **اللّٰھم انزل علیه شئابیب رحمتک ورضوانک**

بمبئی میں مولانا علی میاں نے ۱۳ جون کی رات میں علالت کی خبر پاکر ہوائی جہاز سے جلد از جلد لکھنؤ پہنچنے کی کوشش کی، وہ ۱۴ جون پنجشنبہ کے دن بمبئی سے دہلی پہنچ سکے اور ۱۵ جون جمعہ کی صبح دہلی سے لکھنؤ پہنچ کر رائے بریلی تشریف لے گئے، نسبی رشتہ کے لحاظ سے مولانا اگرچہ مرحوم کے چچا تھے لیکن تعلق وہ تھا کہ بہت سے باپ بیٹوں میں بھی نہیں ہوتا، اس لئے قدرتی طور پر مولانا اس حادثہ سے بے حد متاثر ہوئے اور اس وقت اپنے موجود نہ ہونے کا صدمہ مزید براں! اللہ تعالیٰ ان کو اور سب پسماندگان اور متعلقین کو خاص کر غمزدہ بیوہ اور بچہ کو صبر اور تسلیم و رضا کی توفیق عطا فرمائے۔ **ان فی اللہ عزاء من کل مصیبة ودرکا من کل فائت فباللہ مثقها و ایاہ فارجُ فانما المصاب من حرم الثوب.**

عزیزم مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیر عادی طریقہ پر وہ علمی و قلمی کمال عطا فرمایا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑا فضل و انعام ان پر ان کے رب کریم نے یہ فرمایا تھا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لئے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد مشائخ کی تربیت میں رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بے بہا دولت بھی ان کو اپنے فضل خاص ہی سے عطا فرمادی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دئے گئے ہیں اور محاسن اخلاق بھرپور عطا فرمادئے گئے ہیں۔ **ذلك فضل اللہ یؤتیه من یشاء**

امید ہے کہ آپ نے حضرت والد ماجد کی اس تحریر میں اس محبت اور شفقت و اپنائیت کو بھی ضرور محسوس کیا ہوگا جو ان کے دل میں مولانا محمد الحسنی سے اور اپنے محبوب رفیق حضرت مولانا علی میاں سے اور ان کے خاندان کے ایک ایک فرد سے تھی، سچی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس محبت بھری رفاقت اور ملت اسلامیہ ہندیہ پر مرتب ہونے والے اس کے نہایت مثبت اثرات کو قریب سے دیکھا ہے وہ اب ایک ایک

کر کے رخصت ہوتے جارہے ہیں، کاش کہ کوئی اٹھتا اور عہد رفتہ کو آواز دیتا اور ان پرانی یادوں کو پھر سے تازہ کرتا کہ آج ہم اس خلوص ومحبت کے پہلے سے زیادہ ضرورت مند ہیں....

اب آگے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مولانا محمد الحسنی کے بارے میں ان کے عظیم چچا اور مربی وآئیڈیل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے جو طویل مضمون لکھا تھا اس کے بھی کچھ اہم اقتباسات آپ کی نظر سے گذر جائیں، پڑھنے کے بعد انشاء اللہ آپ خود سمجھ لیں گے کہ یہ ''قصہ پارینہ'' میں کیوں آپ کو دوبارہ پڑھوا رہا ہوں؟ لیجئے پڑھئے ہمارے حضرت مولانا نے اس وقت کیا لکھا تھا؟

> جون ۱۹۷۹ء کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ تھی اور میں بمبئی میں تھا، رات کو میں نے خواب دیکھا کہ لکھنؤ میں محمد علی لین والا ہمارا پرانا مکان ہے، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا زمانہ ہے اور گھر کا وہی نقشہ ہے، جوان کی زندگی میں تھا، وہ خود زندہ سلامت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میرا انتقال ہوگیا ہے، میں عالم برزخ سے اپنے اس پرانے مسکن میں جس میں بچپن اور جوانی گذری، گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، مجھے اس کا رنج بھی ہے کہ جلد ان عزیزوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور تھوڑا سا سہم بھی کہ مجھے قبر میں جانا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا افسوس بھی کررہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، خواب ہی میں مجھے اس کا شعور ہے کہ بھائی صاحب نے عمر طبعی پائی اور میں اس عمر کو نہیں پہنچا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں خاص طور سے معنی خیز جن میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ یا کسی امر کا انکشاف ہو، میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا تعبیر ہوسکتی ہے؟ غالباً اگلے ہی دن شب میں ایک دوست کے یہاں سے دیر میں واپس آیا معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے مولانا محمد منظور نعمانی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ میرے بھتیجے محمد میاں اچانک علیل ہوگئے، ان کو اسپتال میں داخل کردیا گیا ہے، میں جتنی جلد ہوسکے لکھنؤ پہنچ جاؤں....، سنتے ہی ماتھا ٹھنک گیا، کہ اللہ خیر کرے، طبیعت پر فکر وتردد سے زیادہ حزن ویاس کی ایک کیفیت طاری ہوگئی، خواب بھی یاد آیا، دنیا میں اگر (اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے احساس کے ساتھ میرا کوئی مثیل بلکہ ''صورت مثالی'' ہوسکتا ہے تو محمد میاں ہی ہوسکتے ہیں، وہ جب بچے تھے تو ان کی والدہ مرحومہ دعا کرتی تھیں کہ وہ اپنے چچا کے بالکل مثیل ہوں اور اردو کے زنانہ محاورہ کے مطابق ''اپنے چچا کو پڑیں''... اللہ نے جن کو دو پیدا کیا ہے وہ دو ہی رہتے ہیں

پورے طور پر کبھی ایک نہیں ہو سکتے ،لیکن دو میں جو زیادہ سے زیادہ وحدت ،مماثلت اور مشابہت ہوسکتی ہے وہ ہم دونوں چچا بھتیجے میں تھی ،اس کا گواہ خاندان کا ایک ایک فرد ہے ،اس لئے دل کو اور دھڑکا لگ گیا کہ دیکھئے خدا کو کیا منظور کیا ہے؟ کہیں میں نے اپنی شکل میں ان کی مفارقت کو نہ دیکھا ہو.... ٹیلیفون کا پیغام پہنچنے کے بعد ہی ہم لوگ ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے کہ پہلی پرواز سے دہلی اور صبح کی پرواز سے لکھنؤ پہنچ جائیں ،اگر ایسا ہوتا تو وہ محرومی نہ ہوتی جو قسمت میں لکھی تھی اور جوان کے والد اور اپنے باپ کی طرح بھائی کے معاملہ میں اس سے پہلے مئی ۶۱ء میں پیش آچکی تھی اور اس کا داغ زندگی بھر رہے گا—— مولوی معین اللہ صاحب نے یہ بھی انتظام کرلیا تھا کہ دہلی میں بھی یہ بات مجھ سے راز رہے اور لکھنؤ پہنچ کر ہی مجھے اس روح فرسا واقعہ کا علم ہو . . . .،گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو ایک بڑا مجمع پلیٹ فارم پر موجود تھا ،سوگوار اور غم میں ڈوبا ہوا ،لیکن زبانیں بند ،لیکن زبان بے زبانی کہے دیتی تھی کہ واقعہ پیش آچکا ہے ،... رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے گلوگیر اور مرتعش آواز میں واقعہ کی خبر دی۔

اِن سطور کے لکھواتے وقت اچانک وہ دِن یاد آ گیا جب اکتوبر ۱۹۳۵ء کی کسی تاریخ کو بمبئی سے (جہاں بھائی صاحب مرحوم ہی نے ڈاکٹر امبیڈکر سے ملنے کے لئے بھیجا تھا) واپسی پر اچانک گھر میں محمد میاں کی ولادت کا مژدہ سننے میں آیا جو میرے پہنچنے سے دو چار دن پہلے کا واقعہ تھا.....۔

پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ /ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لے آئے ، بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ محمد کو لاؤ ،! میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا ،مولانا نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا ،پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو ان کی مکتب نشینی کا وقت آ گیا تھا ،مولانا (تھانوی) ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی ،کیا عجب ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی شامل رہی ہو.....

آگے حضرت مولانا نے مولانا محمد میاں کی تعلیم وتربیت میں ان کے والد گرامی کے مجتہدانہ طرز اور پھر عربی تحریر کے اُن کے غیر معمولی ملکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کو میں بھائی صاحب کی ایک کرامت ہی سمجھتا ہوں ،انھوں نے اپنے کم سن یتیم بھائی (راقم سطور) کو جس خلوص ،دل سوزی اور جانکاہی کے ساتھ عربی زبان وادب اور دینیات کی تعلیم دلائی

اوراس بارے میں اپنے والد ماجد کا منشا پورا کیا،جس طرح ہرفن کے ماہراساتذہ کا انتخاب کیااور اس دور بینی اور بلندنگاہی کے ساتھ (جس کا ہندوستان کے حالات اوروقت کے دینی وعلمی مشاغل سے کوئی جوڑ نہ تھا)اس کوعربی زبان میں دعوت وتبلیغ کے کام کے لئے تیارکیا،صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے ان کواس کا صلہ اورانعام محمد میاں کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کی ساری لیاقت و صلاحیت کا معاملہ محض وہبی اورخدادادتھا،اور عمل قلیلاو اجر کثیراً کا مصداق تھا۔

گھر کے ماحول،خاندانی اثرات اورفطرت سلیمہ کی بناپرمحمد میاں کواہل قلوب اورخاصان خدا سے گہری عقیدت تھی ، اوروہ تزکیۂ نفس اورتعلق مع اللہ کی اہمیت وضرورت سمجھتے تھے ، .... حضرت مولانا حسین احمد مدنی ان کے گویا خاندانی شیخ تھے،اوران کے والدوالدہ دونوں ان سے بیعت تھے،مولانا لکھنؤ میں بھائی صاحب کے گھر کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے تھے،ڈاکٹر صاحب سے جوتعلق خاص تھااس کی بناپرمحمد میاں پربھی بڑی شفقت کی نظرتھی....اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ مولانا محمد میاں نے مولانا کی سیرت لکھنے کاارادہ کیا....انھوں نے یہ کام شروع بھی کردیا تھا،لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے وہ مکمل نہ ہوسکا۔

اپنے زمانے کے شیوخ وصلحاء میں ان کوحضرت مولانا عبدالقادررائے پوری سے بڑی عقیدت تھی ،حضرت کی لکھنؤ کی مجلسوں میں تووہ شریک ہوتے ہی تھے ،رائے پوربھی گئے اوروہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے ، اللہ تعالی نے حضرت کی آخری علالت میں ان کو لاہورپہنچا دیا،حضرت کا حادثۂ وفات ان کے سامنے ہی پیش آیا،جنازہ کے ساتھ گئے اورحضرت کے وطن ڈھڈیاں جاکرتدفین میں شرکت کی۔

اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاصاحب سے بھی عقیدت ومحبت تھی ، متعدد باروہ رمضان المبارک میں سہارنپورجاکران کی صحبت اوران کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے ۔حضرت شیخ کی مشہورکتاب فضائل نمازکاعربی میں ترجمہ بھی کیاجو الصلوٰۃ ومکانتھافی الاسلام کے نام سے چھپی ہے،جس سے حضرت کی دعائیں ان کوحاصل ہوئیں اورتبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔آخری دورمیں ان کوحضرت مولانا محمداحمد پھولپوری سے بڑاتعلق ہوگیاتھا،مولانا کے عارفانہ کلام کوجمع ومرتب کرنے میں خاص طور پران کی تحریک شامل تھی اوران ہی کے بار بارتقاضے سے دیوانِ محبت کے نام سے مجموعہ مرتب

ہوا، جس کے عناوین ان ہی کے تجویز کئے ہوئے ہیں۔

اِن ذاتی اوصاف اور سلامتی طبع کے اِن مظاہر کے علاوہ عالم اسلام اور بالخصوص عالم عربی کے حالات پر جس طرح کی وہ نظر رکھتے تھے، اس کا بھی حضرت مولانا نے بہت تفصیلی تذکرہ کیا ہے، راقم الحروف کا دل تو چاہ رہا ہے کہ اس سلسلہ کی کچھ عبارتوں کے ۲۔ ۳ اقتباس یہاں نقل کردوں، مگر بے جا طوالت کے خوف سے گریز کررہا ہوں —— جانتا ہوں کہ اپنے ممدوح حضرت مولانا عبداللہ حسنی کے والد گرامی اور جد بزرگوار کے تذکرہ میں ہی جو دراز نفسی میں نے کی ہے اسی کی ''لذیذ بود حدیث دراز تر گفتم'' کہہ کر مجھے معذرت کرنی چاہئے اور سچی بات یہ ہے کہ مسئلہ صرف لذیذ بود کا نہیں ہے —— بلکہ اس ذوق ومزاج کے تذکرہ کا ہے جو ان دونوں بزرگوں والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کی باہم رفاقت نے ایک پورے حلقے کا بنا دیا تھا، جس میں صفائے باطن کے لئے خانقاہی اعمال بھی تھے، اور اللہ والوں سے نیازمندانہ تعلق اور ہر ایک کی قدردانی کا معمول بھی تھا، نیز علم وتحقیق کے لئے درس ومطالعہ اور تحقیق وتصنیف کا اہتمام بھی تھا، اور ''خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات'' کے ساتھ ''وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل'' بھی تھی، جس میں صحافت اور حالات حاضرہ پر نظر کے ساتھ ساتھ تبلیغی جدوجہد کی قدر بلکہ اس میں انہماک بھی تھا..... غرض کہ ان دونوں بزرگوں کی عدیم المثال رفاقت کی وجہ سے جس میں سے ایک دیوبندا اور دیوبندیت کی اور دوسری ندوہ اور ندویت کی شخصیت مثالیہ تھے۔ واقعۃً ایک نہایت مکمل متوازن اور جامع مکتب فکر وجود میں آیا تھا، میں اپنے دل کو کیا کروں بچپن سے اسی مکتب فکر کا شیدائی ہوں، اور اس موضوع پر جب بھی گفتگو چھڑتی ہے تو اپنی زبان وقلم کو روکنا میرے بس میں نہیں رہتا، کاش کہ اِن دونوں بزرگوں کی رفاقت کا جو اثر فکر اسلامی پر پڑا، سے کوئی صاحب نظر اجاگر کرسکتا تو بہت بڑی خدمت انجام پاجاتی۔

بہرحال یہ تھے ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کے باپ دادا، اب آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ ایسے بزرگوں سے شرفِ انتساب رکھنے والا خود کیسا ہوگا ؎

ایں خانہ ہمہ آفتاب است ایں سلسلۂ طلائے ناب است

مولانا خاموش طبع تھے، عربی اور اردو دونوں میں تقریر وتحریر پر اچھی قدرت رکھتے تھے، اپنے ابا میاں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تو تھے ہی ان کی عقیدت کا اصل مرکز، تاہم وقت کے دوسرے بزرگوں سے بھی عقیدت واحترام کا تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا کی تو خاص نظر ان پر تھی، تربیت کے مرحلہ سے گذار کر انھوں نے ان کو تزکیہ وارشاد اور عمومی دعوت کے کاموں پر مامور بھی کر دیا تھا، اور وہ نہایت خاموشی اور سنجیدگی ووقار کے ساتھ ان سب کاموں میں لگے رہتے تھے —— ان کے قریبی لوگوں کو بھی ان کے حلقے کی وسعت اور کام کے پھیلاؤ کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد ہی ہوا، ان کے والد کی پیدائش ان دنوں میں ہوئی تھی جب ان کے والد کے جواں سال چچا (حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی) اپنے بڑے بھائی اور سرپرست کے ایماء پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی گئے ہوئے تھے، پھر ان کے والد (مولانا محمد الحسنی) کی وفات جب ہوئی تب بھی حضرت مولانا علیہ الرحمۃ پیام انسانیت کے عنوان پر ایک دعوتی سفر پر ہی نکلے ہوئے تھے —— ورمیرا خیال تو بعض قرائن کی وجہ سے یہ ہے کہ ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کو بھی اسی دعوت کی راہ میں شہادت کا شرف ملا ہے، حقیقت اللہ بہتر جانے!

برادران وطن میں دعوت کا کام مولانا اس انداز سے کرتے تھے کہ نہ لمبی چوڑی فتوحات کی کارگذاریاں اور نہ کراماتی واقعات کی لن ترانیاں، ایک خاموش اور سنجیدہ انداز تھا، نہ صلے کی تمنا اور نہ ستائش کی پرواہ!

بھٹکل اور حیدرآباد کے سفر سے واپسی پر جب یہ راقم تعزیت کے لئے تکیہ کلاں رائے بریلی حاضر ہوا تو مولانا مرحوم کے چھوٹے بھائی مولانا سید بلال حسنی نے، جو آخری تین ماہ علالت کے دوران مستقل اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہی رہے، بتایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ایک نماز نہ صرف یہ کہ قضا نہیں ہوئی بلکہ ہر نماز باجماعت ادا کرتے تھے، اور سخت تکلیف کے باوجود بیٹھ کر ادا کرنے کا اہتمام کرتے تھے، آخری دن پوری سورۂ بقرہ ریکارڈ سے سنی اور اس کے بعد دوسری سورہ بھی سننی شروع کر دی تھی کہ سانس میں تغیر محسوس ہوا، ایک ہچکی سی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

سچ عرض کرتا ہوں کہ موت سے متصلاً قبل کے یہ احوال سن کر بے حد رشک آیا مولانا عبداللہ حسنی کی قسمت پر، ان کی زندگی ہم جیسوں کے لئے قابل رشک تو تھی ہی، موت زندگی سے بھی بڑھ گئی!!!

اس خانوادے کے بزرگ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ العالی نے ان تمام کاموں کی ذمہ

داریاں مولانا سید بلال حسنی کے سپرد کردی ہیں۔ یہ ناکارہ دست بدعا ہے کہ اللہ تعالی ان کے لئے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بحسن وخوبی تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کو آسان فرمائے، قدم قدم پر غیبی نصرت شامل حال فرمائے۔

یہ راقم اپنی طرف سے، اپنے پورے خاندان کی طرف سے اور ادارۂ الفرقان کی طرف سے مولانا عبداللہ حسنی کے اہل خانہ اور ان کے اکلوتے بچے، ان کے دونوں بھائیوں مولانا عمّار حسنی اور مولانا بلال حسنی اور پورے خانوادۂ حسنی کی خدمت میں، نیز مولانا سے دینی واصلاحی تعلق رکھنے والے سب ہی عزیزوں اور دوستوں کی خدمت میں پیام تعزیت پیش کرتا ہے اور سب سے دعاؤں کا سائل ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ کے نام

حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کا نامۂ تعزیت

[مولانا عبداللہ حسنی کے انتقال سے چند دن پہلے جب مجھے ان کی حالت کی غیر معمولی سنگینی اور اسپتال میں داخل ہونے کی خبر ملی تھی تو اسی وقت سے میں برابر اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کو ان کی حالت سے مطلع کرتا رہا اور ان سے دعاؤں کی گذارش کرتا رہا پھر حادثۂ انتقال کی خبر دینے کا فریضہ بھی مجھے ادا کرنا پڑا، حضرت نے جو تعزیتی خط اس راقم ہی کے ذریعہ سے حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ کی خدمت میں ارسال کیا وہ خط بھی ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔]

باسمہ تعالی

اللہ اللہ اللہ

من فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی

حال نزیل مکہ مکرمہ

یکم فروری ۲۰۱۳ء

محترم المقام یادگار اسلاف حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت فیوضکم وطال بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند روز پہلے عزیز القدر مولانا سجاد نعمانی زید مجدہ کے ذریعہ حضرت مولانا عبداللہ حسنی علیہ الرحمۃ کی شدید علالت کا علم ہوا تھا، فقیر نے حسب توفیق ان کی شفائے کاملہ عاجلہ مستمرہ کے لئے بارگاہ الٰہی میں خوب آہ وزاری کی، مگر ہوتا وہی ہے جو رب کائنات کی مرضی ومنشا، چنانچہ مورخہ ۳۰ جنوری کی شام

ان کے انتقال پر ملال کی خبر وحشت اثر ملی ۔انا للہ وانا الیہ راجعون.کلُّ مَنْ عَلَیْھَافَانٍ کا قانون اٹل ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ حسنی (علیہ الرحمۃ) سے ایک یادگار ملاقات کی سعادت فقیر کو دیار حرم میں نصیب ہوئی ۔مرحوم نے جس محبت والفت اور مسرت وگرم جوشی کا اظہار اس فقیر سے کیا اس کی مٹھاس آج بھی دل میں موجود ہے ۔یہ الفاظ صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے مرحوم کا مسکراتا منور چہرہ آنکھوں کو پرنم اور دل کو پرغم کر رہا ہے۔بقول ع

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی

عجیب بات ہے کہ اس پرفتن دور میں اللہ جل شانہ کے نیک بندے اپنی انوار وبرکات سمیت جس تیزی سے اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں ،یہ جگہ ظلمات سے بھر رہی ہے ،شیاطین اس خلاء کو پورا کر رہے ہیں، یوں لگتا ہے کہ یہ فانی دنیا اپنے انجام کو پہنچا چاہتی ہے۔قحط الرجال کے اس دور میں ایک علمی وعملی شخصیت داعی الی اللہ کا عالم جوانی میں داغ مفارقت دے جانا ہم فقیروں کے لئے سانحہ فاجعہ کی مانند ہے۔ ع

جو بادہ خوار تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

وَمَاکَانَ قَیْسٌ ھلکُہ ھلکَ واحدٍ وَلٰکِنَّہٗ بُنْیَانُ قَومٍ تَھَدَّمَا

بس حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اتنا کہہ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ:اَللّٰھُمَّ لَاتَحْرِمْنَا أَجْرَہٗ وَلَاتَفْتِنَّابَعْدَہٗ

اللہ رب العزت مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے ۔اپنے قرب کے اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے ۔بقول شخصے ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

نیز آنجناب اور دیگر متعلقین کے لئے اس صدمہ کو مقام تسلیم ورضا میں مزید ترقی اور رسوخ حاصل ہونے کا ذریعہ بنائے ۔آمین یارب العالمین۔

مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ان کے اہل خانہ اور دیگر پسماندگان یقیناً غم سے نڈھال ہوں گے۔ان کی تسلی واطمینان کے لئے ایک واقعہ پیش خدمت ہے: سیدنا عباسؓ جب فوت ہوئے تو ان کی تعزیت کے لئے ایک بدوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ع

اصْبِرْنَکُنْ بِکَ صَابِرِیْنَ صَبْرُ الرَّعِیۃِ بَعْدَصَبْرِ الرأسِ

خَيْرٌ مِنَ العَبَّاسِ أجْرُکَ بَعْدَهُ　　وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِنْکَ لِلْعَبَّاسِ

جب سید الاولین والآخرین حضرت محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے پردہ فرمایا تو صحابہ کرام کے لئے اس صدمۂ عظیمہ کو برداشت کرنا اک غم کا پہاڑ اٹھانے کی مانند تھا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے یوں کہا کرتے تھے

فَاصْبِرْ لِكُلِّ مُصِيبَةٍ وتَجَلَّدِ　　وَاعْلَمْ بِأنَّ الْمَرْءَ غَيْرُ مُخَلَّدِ

فَإذَاذَكَرْتَ مُصِيبَةً وَمُصَابَهَا　　فَاذْكُرْمُصَابَکَ بِالنبی محمد

الحمدللہ فقیر نے آج رات عمرہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں مولانا مرحوم کے لئے مغفرت وبلندئ درجات کی دعائیں کیں۔ آئندہ بھی یہ فقیر اس خانوادہ کے ہر فرد کے لئے دعا کرنا اپنی سعادت سمجھے گا۔

اگر فقیر کا محبت بھرا اسلام، دعائیں اور پیام تعزیت مولانا مرحوم کے اہل خانہ، برادران اور دیگر اکابر واصاغر تک بآسانی پہنچ سکے تو فقیر پر احسان ہوگا۔ اپنی دعائے نیم شبی میں اس فقیر کو یاد فرمائیں تو زہے نصیب۔ وَلِلْاَرْضِ مِنْ كَأسِ الْكِرامِ نَصِيبٌ

دعا گو ودعا جو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

کان اللہ لہ عوضا عن کل شیء

(مکہ مکرمہ)

(ب)

مولانا محمد زکریا سنبھلی

ہماری دینی وعلمی برادری کا ایک اور حادثہ

مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں قاسمی، الیٰ رحمۃ اللہ

۱۹؍ جنوری کو مولانا شمس تبریز خاں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

مولانا سے تعلق کا آغاز ۱۹۶۴ء میں اس وقت ہوا تھا جب میں نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا تھا، دارالاقامہ میں مولانا کی قیام گاہ راقم کی قیام گاہ سے قریب ہی تھی، ابھی تک خوب اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا اپنے کمرے کے سامنے (جس میں وہ تنہا ہی رہتے تھے) چارپائی پر بیٹھے ہوئے اکثر وقت محو مطالعہ رہا کرتے تھے، اس کم عمری میں بھی ان کا معمول نماز سے کافی پہلے مسجد پہنچ جانے، صف اول کی پابندی کرنے اور کثرت تلاوت کا تھا، کچھ تو اس لیے کہ دارالعلوم میں وہ مجھ سے دو سال آگے تھے اور کچھ اس لیے کہ فطرتاً کم گو اور کم آمیز تھے ان سے وہاں تعلق بس سلام دعا تک ہی محدود تھا۔

مولانا کے ساتھ تعلق میں اضافہ اس وقت ہوا جب میں ۱۹۷۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس آیا، مولانا کو یہاں مجلس تحقیقات ونشریات کا رفیق پایا، ان کا برادر محترم مولانا عارف صاحب سنبھلی مرحوم سے دوستانہ تعلق تھا، اس وجہ سے پرانی سلام دعا اب قریبی تعلق میں بدلنے لگی۔ مجلس تحقیقات کی رفاقت کے زمانے میں انہوں نے متعدد تصنیفی کام کیے، علامہ ابن تیمیہ کی کتاب **اقتضاء الصراط المستقیم** اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی روائع إقبال کا اردو ترجمہ کیا، تاریخ ندوۃ العلماء کی دوسری جلد لکھی، اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ان کے اسی عہد کی یادگار ہیں۔ پھر مولانا لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہوگئے، لیکن مولانا کا ہر جاننے والا یہ گواہی دے گا کہ وہاں جانے کے بعد بھی وہ اپنی نجی زندگی میں اپنے پرانے رنگ پر ہی بڑی حد تک قائم رہے۔

حسن اتفاق کہ ہم دونوں نے جب لکھنؤ میں ذاتی گھر بنانے کا فیصلہ کیا تو زمین ایک ہی محلہ کی ایک ہی گلی میں بالکل پاس پاس ملی، ۲۰۰۰ء میں میں اپنے گھر میں منتقل ہوا اور مولانا بھی چند ماہ بعد اپنے گھر میں آگئے، یہاں مولانا کو پڑوسی کی حیثیت سے دیکھا، بلا جھجک شہادت دی جاسکتی ہے کہ یونیورسٹی کی پروفیسری کے باوجود دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کی طرح وہ ابھی بھی مسجد کافی پہلے پہنچتے، صف اول کی پابندی کرتے اور کثرت تلاوت کا معمول رکھتے، ان صفات کے علاوہ وہ نہایت خاموش مزاج اور نرم مزاج تھے، شاید ہی زندگی میں کسی کو ان سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔

ایک زمانے میں مولانا مرحوم کے مضامین الفرقان میں شائع ہوتے رہے ہیں، اس لیے ان کا حق ہے کہ قارئین ان کے لیے حتی الامکان دعائے مغفرت کریں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، غلطیوں سے درگزر کرے، اور انہیں اعلیٰ علیین میں مقام دے۔ آمین

☆☆☆

محفل (۱۲۴) سورۃ المائدۃ (۲)

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہٗ

تمام ہی پاکیزہ چیزیں تمھارے لئے حلال رکھی گئی ہیں

اہلِ کتاب کا کھانا بھی حلال، ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیم بِسمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۴ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۵

ترجمہ

لوگ تم سے پوچھتے ہیں کیا چیزیں ان کے واسطے (کھانے کو) حلال رکھی گئی ہیں؟ کہو کہ حلال کی گئی ہیں تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لئے، اور تمہارے سدھائے ہوئے شکاری جانور، جنھیں تم نے اللہ کے دئے اپنے علم وفہم کے مطابق تربیت دے رکھی ہو، ان کا کیا ہوا شکار (بھی تمہارے لئے حلال ہے) پس جو شکار وہ تمھارے لئے تھامے رکھیں اسے کھاؤ۔ اور اللہ کا نام اس پر لے لیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ بے شک جلدی ہی حساب لے لیتا ہے (۴)

آج حلال تمھارے لئے کردی گئی ہیں تمام پاکیزہ چیزیں اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی (اہلِ کتاب) ان کا کھانا بھی تمھارے لئے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ اور پاکباز مؤمن عورتیں اور پاکباز اہلِ کتاب عورتیں (تمھارے لئے حلال ہیں) جب کہ تم ان کے مہر انھیں دے رہے ہو قیدِ نکاح میں لا رہے ہو نہ کہ علانیہ مستیاں نکالنے والے یا خفیہ یارانے گانٹھنے والے ہو۔ اور (جان لو کہ) جو کوئی ایمان (کے تقاضوں) سے منکر ہوا اس کا عمل اکارت گیا اور آخرت میں وہ نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوا۔ (۵)

اوپر کے بیان سے پیدا شدہ کچھ سوال اور قرآن کا جواب

ان سے اوپر کی آیات میں مویشی قسم کے جانوروں (بہیمۃ الأنعام) کی حلّت کا ایک فقرہ میں اعلان کرنے کے بعد فوراً فرمایا گیا کہ اس میں کچھ صورتوں اور کچھ حالتوں کا استثناء ہے۔ پھر اس استثناء (یعنی حرام صورتوں کی) تفصیل اور اس کی پابندی پر زور دیتے ہوئے یہ سلسلۂ کلام تمام ہوگیا۔ اصولی طور پر تو بات میں کوئی تشنگی نہیں رہ جاتی تھی مگر حرمتوں کی لمبی تفصیل میں شاید بہت سے لوگوں کے لئے وہ شروع کا حلّت والا فقرہ گم ہوگیا یا اس کا دائرہ ان پر مشتبہ ہوگیا۔ اور ایسے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے رجوع ہونا تھا۔ بظاہر یہی کچھ صورتِ حال ہے جس میں یہ اوپر کی دونوں آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ فرمایا گیا کہ ''لوگ تم سے (اے نبی) پوچھتے ہیں کہ حلال ان کے لئے کیا رکھا گیا ہے''؟ پھر اس کے جواب کے لئے ہدایت فرمائی گئی کہ ان لوگوں کو بتا دیا جانا چاہئے کہ حلت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ''ہر پاکیزہ شئ تمھارے لئے حلال ہے۔''

یہاں یاد رہنا چاہئے کہ کھانے کی چیزوں کے بارے میں ان کے فی نفسہٖ حرام اور حلال ہونے کا مسئلہ (جو ایک دینی اور اعتقادی مسئلہ ہوتا ہے) صرف جانوروں ہی کے دائرہ میں، یعنی لحمی غذاؤں کے بارے میں، پیدا ہوتا ہے۔ باقی زمین سے جو کچھ اگتا ہے اور درختوں پر جو کچھ اُترتا ہے وہ اس مسئلہ کے دائرہ سے باہر ہے، اس میں سے جس چیز کو بھی انسانی طبیعت لیتی ہے وہ بالکل جائز اور ''طیّبات'' میں شامل ہے، بشرطیکہ کسی حرام طریقہ (چوری غصب وغیرہ) سے حاصل نہ کی گئی ہو۔

شکاری جانوروں سے کرائے گئے شکار کی حلّت اور شرائط

حلال غذاؤں کے دائرہ کی تنگی کے شبہ سے متفکر مسلمانوں پر اس دائرہ کی وسعت کھولتے ہوئے مزید فرمایا گیا: تم جو جانور اپنے شکاری جانوروں (کتوں اور شکروں وغیرہ) کے ذریعہ شکار کرتے ہو ہم نے

وہ بھی تمھارے اوپر اس حد تک حلال رکھے ہیں کہ تمھارا شکاری جانور اگر سدھایا ہوا (Trained) ہے (کہ جو کہوا سے سمجھے اور عمل کرے اور تمہارے اشارہ ہی سے شکار پر دوڑے) تو اس کا پکڑا شکار تم اگر ذبح بھی نہ کر سکو تب بھی حلال ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس نے ٹریننگ کے مطابق شکار کو خود کھایا نہ ہو بلکہ تمہارے لئے پکڑ کے رکھا ہوا ہو، نیز اس پر نام اللہ کا لیا گیا ہو۔

آیت میں یہ بات صاف طور پر اگرچہ نہیں ہے کہ اس جانور کا ذبح کیا جانا شرط نہیں۔ مگر جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کے کوئی اور معنیٰ ہی نہیں ہوتے۔ ذبح کی شرط ہو تو پھر شکاری اور غیر شکاری جانور کا کیا فرق؟ چنانچہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ شرط بس یہ ہے کہ اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ رہا یہ کہ اللہ کا نام کس وقت لیا جانا کافی ہے؟ تو آیت کے الفاظ سے تو گو ایسا لگتا ہے جیسے کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لینے کو کہا جا رہا ہے، مگر حدیثِ نبوی ﷺ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا وقت وہ ہے جب کتا یا شکرہ وغیرہ شکار پر چھوڑا جائے۔ یعنی اس وقت بسم اللہ پڑھی گئی ہو۔

حدیث کے مطابق حضرت عدی بن حاتم صحابیؓ نے حضور ﷺ سے تیر سے شکار اور کتے سے شکار کے بارے حلال اور حرام کا مسئلہ دریافت کیا تھا تو کتے کے بارے میں ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ''بسم اللہ کہہ کر چھوڑا تھا اور اس نے خود کھایا نہیں بلکہ تمھارے لئے روکے رکھا تو کھالو ورنہ نہیں''۔ حضرت عدیؓ نے مزید پوچھا کہ میں اگر شکار کے پاس پہنچ کر دیکھوں کہ کوئی دوسرا کتا بھی وہاں موجود ہے۔ (جس کا مطلب یہ ہوا کہ شکار مارنے میں وہ بھی شریک ہوسکتا ہے) تب کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ''پھر مت کھاؤ''، اس لئے کہ بسم اللہ تو تم نے بس اپنے کتے پر پڑھی تھی۔ اس حدیث سے بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ کس وقت بسم اللہ پڑھ لی جانی شرط ہے۔

تربیت کا یہ معیار کہ وہ شکار کو کھائے نہیں یہ کتے (یا اس جیسے کسی درندہ) کے لئے ہے۔ شکاری پرندہ کے بارے میں معیار یہ ہے کہ مالک اگر درمیان ہی میں اسے واپسی کی آواز دے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ پلٹ پڑے۔ یہ فرق غالباً ان دونوں کی سرشت اور طبیعت کے فرق کی بنا پر رکھا گیا ہے۔ بہرحال ان جانوروں کا اس معیار پر پورا اترنا اس بات کی علامت بنتی ہے کہ یہ اپنے لئے نہیں مالک کے لئے شکار کر رہے ہیں، اس لئے شکار کو مار لینے میں ان کا عمل مالک کا عملِ ذبح ہے اور وہ بسم اللہ کے ساتھ ہوا۔ یاد رہے کہ شکاری درندے یا پرندے شکار کو گردن ہی سے پکڑتے ہیں اور ان کے دانت یا پنجے گردن میں گڑ کر کچھ خون بہا دینے کا باعث ضرور بنتے ہیں جو ایک طرح کا عمل ذبح ہے۔

جائز انسانی حاجتیں اور احکامِ قرآنی کی وسعت

شکار کی بابت قرآن کا یہ حکم جس سلسلۂ کلام میں آرہا ہے اس سے ظاہر ہورہا ہے کہ یہ شکار محض کوئی تفریحی شغل نہیں، بلکہ حصولِ غذا کا ایک ذریعہ اور معاشرہ کی ایک قابلِ لحاظ ضرورت تھی۔ اور ہونا ہی چاہئے تھی، کہ یہ معاشرہ بڑی حد تک بدوی قبائل پر مشتمل معاشرہ تھا۔ اور شکار اہلِ بدو کی گزران کا ایک اہم ذریعہ۔ نیز ایک قابلِ لحاظ ضرورت کے ماتحت جس درجہ کا توسُّع اور اس حکم میں نظر آرہا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ قرآن اپنے احکام میں وہ سختی ہی نہیں رکھتا جس کا کہیں کہیں تاثر مل سکتا ہے، جیسا کہ خود یہیں کی آگے پیچھے کی آیتوں سے بھی۔ بلکہ اتنی نرمی اور وسعت بھی رکھتا ہے جو اس شکار والے حکم سے ظاہر ہے۔ پس یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی ہر بات کا ایک موقع اور ایک محل ہے۔

آگے حکم کے بیان کے خاتمہ پر ارشاد ہوا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۔ کھاؤ پیو مگر اللہ سے ڈرتے رہنا یہ ہرگز نہ بھولنا کہ اس کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔ یعنی اجازت جس حد تک اور جیسی دی گئی ہے اسی کے حدود میں اپنے آپ کو رکھنا لازم ہے۔ اس تنبیہ کے سلسلہ میں مزید ایک روایت بھی آئی ہے جس سے یہ تنبیہ شکار میں پیوست کچھ دوسرے خطرات کا بھی احاطہ کر لیتی ہے۔ روایت کے مطابق ایک صحابی نے عرض کی: یارسول اللہ، ہمارا رزق شکار میں رکھ دیا گیا ہے لیکن اس میں ذکر اللہ سے غفلت ہوتی ہے جماعت کی نماز بھی چلی جاتی ہے۔ تو اس حالت میں بھی ہمارے لئے اس کی حلّت ہوگی؟ سو یہ ہیں شکار میں پیوست دوسرے خطرات۔ ان خطرات کے مقابلہ میں آدمی تقوے کا تقاضہ کیسے پورا کرے گا؟ اس کا جواب ان صحابیؓ کو دئے گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے ملتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ کسی کا رزقِ حلال اگر اسی پر موقوف ہورہا ہے اور وہ لازم آجانے والی کوتاہیوں پر افسوس رکھتا ہے، دل اس کا مسجد میں اور جماعت میں رہتا ہے تو ضرورت کی حد تک حلال ہی ہے۔ (روح المعانی بحوالۂ طبرانی) لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جانا چاہئے کہ شکار کے مسئلہ میں حِلّت کا یہ قانون صرف ضرورتمندانہ شکار ہی کو جواز عطا کرتا ہے۔ حدود و شرائط کی پابندی کے ساتھ شکار تفریحی نوعیت کا بھی ہو تب بھی جائز بہرحال رہے گا۔ البتہ اس میں ان لازمی کوتاہیوں کا مسئلہ جن پر فکرمندی سے یہ ایک صحابیؓ کا سوال روایت میں آیا اور زیادہ قابلِ فکر ٹھیرے گا۔

اس وسعت کا ایک اور نمونہ

آگے ایک اور ایسی ہی وُسعت کا در کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ اوپر ''اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ'' سے حلال چیزوں کی بابت سوال کا جواب شروع ہوا تھا، اسی کے ذیل میں شکاری جانوروں کا

مارا شکار (جب تک وہ ''طیّبات'' کے زمرہ میں آسکتا ہو) حلال بتایا گیا۔ اب بتایا جارہا ہے کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے، تو یہاں بھی اس کے طیّبات میں سے ہونے کی شرط یاد دلانے کو ''اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰت'' کا کلمہ پھر دہرایا گیا اور تب ارشاد ہوا ''وَطِعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ' اور اہلِ کتاب کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے۔ نیز تمھارا کھانا ان کے لئے حلال ہے (وَطعامُکم حِلٌّ لَّھُمْ) اور کھانا ہی نہیں ان میں کی عورتیں بھی تمھارے لئے حلال جیسے کہ مؤمن عورتیں حلال۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصِنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ ۔۔۔۔۔'' (اور حلال ہیں تمھارے لئے پاکباز مؤمن عورتیں اور پاکباز اہلِ کتاب عورتیں، جبکہ تم پاکبازی کے لئے ان کو بیویاں بنا رہے ہو کھلی یا چھپی زنا کاری نہیں کررہے۔)

اہلِ کتاب کا کھانا، یعنی ذبیحہ (جس میں حلال حرام کا سوال پیدا ہوتا ہے) وہ مسلمانوں کے لئے حرام تو کبھی نہیں تھا اور نہ ہوسکتا تھا، کہ ان کے یہاں بھی اس معاملہ میں حلال حرام کا قانون اسلامی قانون کے مطابق تھا۔ غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک یہودیہ کی طرف سے گوشت کا سالن بھیجا جانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے نوش فرمانا اس بنا پر ایک مشہور واقعہ ہے کہ اس میں زہر ملایا گیا تھا۔ اور ہمارا کھانا اہلِ کتاب کے لئے حلال نہ ہونے کا سوال کیا ہوسکتا تھا؟ ہمارا کھانا تو وہ ہے جو اللہ کا حلال ٹھیرایا ہوا ہے۔ وہ کسی کے لئے حرام رہا ہو یہ کیسے ممکن؟ البتہ اہلِ کتاب کا جو رویہ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں اب تک چلتا آیا تھا اسے قدرتی طور پر ساتھ کھانے پینے کی صورتیں پیدا ہونے سے مانع ہونا تھا۔ اور یہ عملی صورتِ حال، دین کی تکمیل پر قرآن کی تنزیل ختم ہوجانے اور لازماً پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی جلد ہی رخصت ہوجانے پر، ملت میں ایک ذہنی انتشار اور اختلاف کا باعث (یعنی جواز اور عدمِ جواز یا کم از کم کراہت اور عدمِ کراہت کے سوالات کھڑے ہونے کا باعث) ہوسکتی تھی، خاص کر آگے آنے والے اس دور میں جس میں مسلمانوں کو نصاریٰ کے علاقوں میں فاتحانہ پہنچنا اور بسنا تھا۔ پس، حقیقت تو اللہ جانے، بظاہر اسی مصلحت سے تکمیلِ دین کے اس موقع پر ایک وضاحتی اعلان کے طور پر یہ ارشادات نازل فرمائے گئے۔ البتہ ان کی عورتوں سے رشتۂ ازدواج جائز ہونے کے اعلان کو وضاحتی نہیں کہا جاسکتا، وہ مسئلہ کا ابتدائی اعلان ہے۔

اہلِ کتاب خواتین سے شادی کا مسئلہ

کھانے پینے سے متعلق حلّت وحرمت کے سلسلۂ بیان میں اس ایک بالکل جداگانہ معاملہ سے متعلق اعلان کی مناسبت؟ کا سوال کسی کے ذہن میں آسکتا ہے۔ تو یہاں مناسبت کی دو بنیادیں موجود ہیں۔

اوّلاً اس سے وضاحتی بیان مزید مؤکّد ہوجاتا تھا، کہ جب ان کی عورتوں سے رشتۂ ازدواج قائم کیا جاسکتا ہے تو ساتھ کھانے پینے میں کسی کراہت یا عدمِ جواز کا کیا سوال رہ گیا۔ بلکہ اس طرح کی رشتہ داری کے بعد تو ساتھ کھانے پینے سے پرہیز کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ جسمِ انسانی کی دو ہی بنیادی مانگیں (Demands) ہیں۔ ایک کا تعلق پیٹ سے دوسرے کا تعلق جنس سے۔ پیٹ کی مانگ کی طرف سے اطمینان کا سامان کردئے جانے کے بعد توجہ دوسری ایسی ہی اہم فطری مانگ کی طرف فرمائی گئی ہے۔ اور زیادہ قرینِ قیاس یہی دوسری مناسبت ہے۔ اس لئے کہ اعلانِ جواز کو صرف کتابیات تک محدود نہیں رکھا گیا ہے، مؤمنات کا بھی ذکر ساتھ میں ہے حالانکہ ان کی حلت تو پہلے سے معلوم تھی۔ اور ان کا نہ صرف ذکر ہے، بلکہ کتابیات سے پہلے ہے۔

ذکر کی یہ ترتیب کہ مؤمنات کو مقدم کیا گیا ہے اپنے اندر یہ حکیمانہ اشارہ لئے ہوئے بھی نظر آتی ہے کہ اوّلیت مؤمنات ہی کو دی جانی چاہئے، دوسروں کا معاملہ صرف جواز کا سمجھا جائے۔ نیز ان دونوں ہی کے سلسلہ میں ''محصنات'' کی قید ایک بالکل کھلا اشارہ یہ بھی دے رہی ہے کہ شادی کے لئے شرافت و پاکبازی کا وصف پہلے دیکھنا چاہئے۔ اور قربان اس حکمتِ بیان کے، کیسا صاف اشارہ اس میں عورتوں کے سمجھ لینے کے لئے بھی ہے نکل رہا ہے کہ مسلم معاشرہ میں نکاح میں لئے جانے کے قابل عورت دراصل وہی ہے جو اس وصف کا شرف رکھتی ہو! (ورنہ نکاح تو ہو ہی جاتا ہے۔) سبحان اللّٰہِ و بحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم!

کتابیات سے شادی اور حضرت عمرِ فاروقؓ

اس آیت کے ذیل میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے عہدِ خلافت میں فتوحات کی مہموں کے درمیان جب بعض صحابہؓ نے اس قرآنی بیانِ جواز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتابیات سے نکاح کرلیا تو آپ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس واقعہ کو حضرت عمرؓ کے جن الفاظ میں حضرت امام ابوحنیفہ کے حوالہ سے روایت کیا گیا ہے (معارف القرآن، از مفتی محمد شفیع صاحب بحوالۂ کتاب الآثار از امام محمد) اس کے مطابق حضرت عمرؓ کی مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ یہ سلسلہ مسلمان عورتوں کے لئے مصیبت بنے گا (وَ کفیٰ بِذٰلِکَ فِتْنَۃً لِنسآئِ المُسْلِمین) گویا آپ کا فرمانا تھا کہ مسلمانوں پر اول حق مسلمان عورتوں کا ہے۔ اور یہ بعینہٖ وہی بات ہے جس کے بارے میں اوپر عرض کیا گیا کہ قرآن نے اس بیانِ جواز میں مؤمنات کا ذکر مقدم کرکے ان کو مقدّم رکھنے کی طرف اشارہ رکھدیا ہے۔ اور یہ اشارہ حضرت عمر پر مخفی رہنے والا کہاں تھا؟ آپ کے قلبِ مؤمن کا تو وہ حال تھا کہ ایک نہیں کئی بار یہ ہوا کہ قرآنی آیات کی شکل میں

نازل ہونے والے احکام اپنے نزول سے قبل دلِ فاروق میں اُبھرنے والے تقاضوں کی شکل اختیار کر گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ! اور فاروقِ اعظم کے اس رویہ کے بعد ضرورت نہیں رہ جاتی کہ آج کل کے زمانے میں ان عورتوں سے شادی کی بابت کچھ کہا جائے۔ آج تو ان کے اندر ''محصنات'' کے وصف کو ایک عنقا شئ کہئے تو ذرا مبالغہ نہیں۔ اور اس کے بغیر تو قرآن کی اجازت بھی ان کے حق میں کہاں رہ جاتی ہے؟

ایک تنبیہ جو مؤمن کو گرہ باندھ کر رکھنے کی ہے!

آغازِ سورہ سے چلا ہوا احکام کا یہ سلسلۂ بیان ختم ہوا تو آخر میں بہت غیر معمولی الفاظ والی ایک تنبیہ ہے۔ فرمایا :وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۔۔۔۔(اور وہ کہ جس نے ایمان کے تقاضوں سے کفر کا رویہ اپنایا اس کے سارے عمل اکارت اور آخرت میں حساب کتاب کے موقع پر خسارہ ہی خسارہ اس کے نصیب میں ہوگا۔) یہ تنبیہ صرف اپنے الفاظ کی رو سے ہی ہماری بے حد توجہ کے قابل نہیں ہے، اس کا دوسرا قابلِ لحاظ پہلو یہ بھی ہے کہ یہ تکمیلِ دین کے موقع کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقتِ ''الوداع'' کی تنبیہ ہے۔ انسانی مجبوریوں کی بات تو اور ہے لیکن جان بوجھ کر کسی حکمِ حق کی خلاف ورزی اگر مؤمن سے ہوجائے تو اس تنبیہ کا حق ہے کہ اس کے حوالہ سے اس ڈر کی کیفیت اس کے دل پر طاری ہو کہ خدانہ کرے کہ وہ ''کفر بالایمان'' کا مرتکب ہوگیا ہو۔ اللّٰھُمّ ثَبِّتْ قلوبنا علیٰ دینک!

☆☆☆

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھئے قاعدہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت	پرنٹر و پبلشر کا نام و پتہ قومیت	ایڈیٹر کا نام و پتہ، قومیت	ملکیت
لکھنؤ	محمد حسان نعمانی، (۳۱، نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ) ہندوستانی	خلیل الرحمٰن سجاد، (۳۱، نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ) ہندوستانی	خلیل الرحمٰن سجاد (پروپ رائٹر)

میں محمد حسان نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

دستخط: محمد حسان نعمانی

حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم
ترتیب وپیشکش: محمد اختر معروفی

میاں بیوی کی جذباتی ضروریات

انبیاء کرام کی ازدواجی زندگیوں کے چند نمونے

اب آیئے ہم ذرا احادیث کی نظر میں سلف صالحین کی زندگیوں کو دیکھیں کہ وہ اگر میاں بیوی بن کر رہتے تھے اور اتنی پیار محبت کی زندگی تھی تو وہ کیسے ایک دوسرے کو یہ سب چیزیں دیتے تھے، حالانکہ وہ ٹرینالوجی (علم نفسیات کی اصطلاحات) سے واقف نہیں تھے، وہ ان اصطلاحات کو جانتے نہیں تھے، البتہ قرآن اور احادیث مبارکہ کی تعلیمات ایسی ہیں کہ اگر انسان بیوی کے حقوق پورے کرے، بیوی خاوند کے حقوق پورے کرے تو خاوند کو وہ ملتا ہے جو اسے چاہئے اور بیوی کو وہ ملتا ہے جو اسے چاہئے۔

چنانچہ ہم پہلے بیوی کی ضروریات کی طرف آتے ہیں۔ پہلی چیز بیوی کو care (خیال رکھنا) چاہئے، خبر گیری چاہئے، تو ذرا دیکھئے کہ حضرت موسیٰؑ کی اہلیہ حاملہ ہیں، سردی کا موسم ہے، ٹھٹھر رہی ہیں، خاوند نے محسوس کیا کہ میری بیوی کو گرمی کی ضرورت ہے، اب وہ نکلے آگ کی تلاش کرنے کے لئے تو موسیٰؑ کا آگ ڈھونڈنے کے لئے نکلنا اس بات کی دلیل ہے کہ اپنی بیوی کی care ان کے دل میں تھی اور اسی موقع پر اللہ نے ان کو نبوت عطا فرمائی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جس اونٹ پر عورتیں سوار تھیں اس کی لگام ایک صحابیؓ کے ہاتھ میں تھی، جن کا نام تھا انجشہؓ، ایک موقع پہ وہ اونٹ کو ذرا تیز چلا رہے تھے، جب ان کو نبی علیہ السلام نے اونٹ تیز چلاتے دیکھا تو نبی علیہ السلام نے فوراً کہا کہ انجشہ! تمہارے اس اونٹ کے اوپر شیشہ کی بنی ہوئی چیزیں سوار ہیں، ان کا خیال رکھو، نبی علیہ السلام نے ''قوارير'' کا لفظ استعمال کیا، جس کا ترجمہ ''شیشہ کی بنی ہوئی چیزیں'' بھی کہہ سکتے ہیں اور اگر مجھ سے ترجمہ کروائیں تو اس کو ڈائیمنڈ بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی یہ نازک چیزیں یا نازک

personalitiesاس اونٹ کے اوپر سوار ہیں، تم تیز چلاؤ گے تو ان کو مشقت ہوگی ۔اللہ کے پیارے حبیب ﷺ کی زندگی پہ قربان جائیں کہ عورتوں کی اتنی سی تکلیف کا بھی فوراً خیال کیا، اس کو care کہتے ہیں۔

حجۃ الوداع ہی کی بات ہے کہ نبی علیہ السلام جب حج کر کے واپس تشریف لائے تو آپ واپس آنا چاہتے تھے، خیمہ میں آئے تو عائشہ صدیقہؓ رو رہی تھیں، پوچھا عائشہ! کیوں رو رہی ہو؟ کہا اے اللہ کے حبیب ﷺ ! آپ تشریف لائے تھے تو آپ نے عمرہ کیا تھا، میں عذر کی وجہ سے حرم میں داخل نہیں ہو سکتی تھی، اب حج تو میں نے کر لیا، عمرہ تو میں کر نہیں سکتی، اب واپس آنا تھا لیکن نبی علیہ السلام نے فرمایا: اچھا ہم یہاں انتظار کرتے ہیں، تم اپنے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ چلی جاؤ اور عمرہ کر کے آجاؤ۔ تو دیکھئے یہ ان کی ایک جائز تمنا تھی، ایک خواہش تھی، جس پر وہ اداس ہو کے رو رہی تھیں تو اللہ کے پیارے حبیب ﷺ نے ان کی care کا اظہار کیا۔ تو عورتوں کی اس طرح کی چیزوں کا خیال رکھنا یہ مرد کے فرائض میں شامل ہے.

دوسری چیز ہوتی ہے understanding، ذہنی ہم آہنگی ۔ چنانچہ نبی علیہ السلام کی مبارک زندگی میں یہ چیز بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت صفیہؓ جو پہلے یہودیہ تھیں، پھر اسلام لائیں، نبی علیہ السلام کے نکاح میں آ گئیں تو جس دن نکاح ہوا اور وہ نبی علیہ السلام کے پاس آئیں تو اللہ کے حبیب ﷺ چاہتے تھے کہ آج ان سے میری ملاقات ہو جائے، مگر اسی دن تو خیبر فتح ہوا تھا، اسی دن تو اس کا خاوند قتل ہوا تھا یا باپ قتل ہوا تھا، قوم کے لوگ مارے گئے تھے، تو صفیہؓ کی طبیعت پر کچھ غم تھا، نبی علیہ السلام چاہتے تھے کہ آج ہی رخصتی ہو جائے، چنانچہ جب آپ ان کے خیمہ میں تشریف لے گئے تو آپ نے اظہار فرمایا کہ میں ملنا چاہتا ہوں، انھوں نے عرض کیا اے اللہ کے حبیب ﷺ ! ہم ملاقات کل رات پہ موخر کر لیتے ہیں، تو نبی علیہ السلام نے ان کی بات کو قبول فرما لیا۔ اب ذرا سوچئے کہ عام مرد کی جب میل ملاپ کی طبیعت ہوتی ہے تو اس کے لئے تو پھر منٹ گذارنا بھی مشکل ہوتا ہے، مگر اللہ کے حبیب ﷺ نے ان کی طبیعت کو سمجھا، ان کی سوچ کو سمجھا کہ یہ غم زدہ ہے اور یہ چاہتی ہے کہ آج نہیں کل ملاقات ہو جائے تو اللہ کے حبیب ﷺ نے ان کی بات کو مان لیا، پھر جب دوسرے دن ملاقات ہوئی تو اس وقت انھوں نے کہا کہ کل میں نے اس لئے نا کی تھی کہ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ تو میرے ساتھ میل ملاپ میں مصروف ہوں اور آپ کے دشمن اتنا قریب تھے ڈر تھا کہ وہ کہیں آپ کے خیمہ پہ حملہ نہ کر دیں، مجھے آپ کی جان زیادہ

عزیز تھی، اس لئے میں نے اس کام سے نا کہی تھی۔ تو دیکھئے نبی علیہ السلام نے ان کی کیفیت کو understand (سمجھنا) کیا۔ عورت کا مزاج کچھ ہوتا ہے، طبیعت کچھ ہوتی ہے، کیفیت کچھ ہوتی ہے، لہٰذا مرد کو بھی چاہئے کہ اس کو understand کرنے کی کوشش کرے بلکہ مرد اور عورت کی سوچ تو بالکل ایک ہونی چاہئے، چنانچہ ایک میاں بیوی کی بات سنئے کہ بچے بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ماں سے کوئی بات کر رہے تھے اور وہ کوئی بات کہہ رہی تھی کہ ایسا نہیں، ایسے کرنا چاہئے، کافی دیر بات چیت ہوتی رہی، اچانک ادھر سے میاں صاحب آگئے، تو بیٹے نے اپنے ابو سے بات شروع کردی کہ ابو! اگر ایسا ہو تو کیسا ہوگا؟ اللہ کی شان کہ انھوں نے وہی بات کہی جو بیوی نے کی تھی، تو وہی بات سن کے بیٹا کہنے لگے لگا: کیا کروں کہ ان دونوں understanding اتنی ہے۔ تو یہ زندگی کا مزہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کی سوچ بالکل ایک ہو تو پھر اولاد کے اوپر اس کے بہت مثبت اثرات ہوتے ہیں۔

تیسری چیز ہوتی ہے عورت کو respect (عزت) ملنا۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے اپنی بیویوں کو عزت دی جس کی مثالیں احادیث میں موجود ہیں۔ ذرا غور کیجئے صفیہؓ کی جو رخصتی ہوئی تو اگلے دن سفر تھا، ان کو اونٹ پہ سوار ہونا تھا، اب عورت کے لئے اونٹ پر چھلانگ لگا کے سوار ہونا تو ممکن نہیں، یہ کام تو مرد کر جاتے ہیں، اب وہ کیسے اونٹ پہ چڑھیں؟ تو اللہ کے حبیب ﷺ پاس موجود تھے، حدیث پاک میں موجود ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی ران مبارک آگے کی اور فرمایا صفیہ! تم میری ران کے اوپر پاؤں رکھو اور اس کو سیڑھی بنا کر تم جھک کے چڑھ جاؤ۔ اللہ کے پیارے حبیب ﷺ کا یہ عمل مردوں کے لئے Eye Opener (چشم کُشا) ہے کہ اللہ کے محبوب ﷺ ایک ضرورت کو محسوس فرما کر اپنی ران کو پیش فرما رہے ہیں کہ تم اس پہ پاؤں رکھو اور اپنے اونٹ کے اوپر چڑھ جاؤ۔

ایک صحابی نے نبی علیہ السلام کو دعوت دی کہ اے اللہ کے حبیب ﷺ! آپ میری طرف سے کھانا قبول فرمائیے، آپ نے فرمایا: اور عائشہ؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، میرے پاس تو اتنا ہے کہ میں صرف آپ کو کھلا سکتا ہوں، فرمایا میں نہیں آؤں گا، پھر دوبارہ انھوں نے کہا، آپ نے کہا میں نہیں آؤں گا، جب تیسری مرتبہ انھوں نے کہا کہ جی ہاں میں آپ کی بیوی کی بھی دعوت کروں گا تو نبی علیہ السلام نے فرمایا اب میں تمہاری دعوت قبول کروں گا۔ تو بیوی کو عزت دلانا یہ تو میاں کے اختیار میں ہوتا ہے، اب اگر خاوند بیوی کو ایسی عزت دے تو وہ کیوں نہیں خاوند پہ قربان ہوگی۔

چوتھی چیز ہے devotion اپنائیت، یعنی عورت کو یہ احساس دلانا کہ میں آپ کا ہی ہوں، میں separate personality نہیں ہوں، میں ایسا نہیں ہوں کہ گھر میں تمہیں بسا رہا ہوں، من میں کسی اور کو بسا رہا ہوں، یہ مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے ۲۵ سال کی عمر میں جب خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ نکاح فرمایا تو آپ غور کیجئے کہ خدیجۃ الکبریٰؓ اس سے پہلے دو خاوند کے ساتھ رہ چکی تھیں، اور یہ تیسرا نکاح تھا اور ۱۵ سال کی عمر کا فرق بھی تھا، وہ ۴۰ سال کی تھیں اور اللہ کے حبیب ﷺ ۲۵ سال کے تھے اور عورتیں محسوس کرسکتی ہیں کہ ۴۰ سال کی عمر میں عورت کی جوانی کتنے فیصد باقی رہ جاتی ہے، اس عمر میں نبی علیہ السلام نے ان سے نکاح فرمایا اور ان کی پوری زندگی نبی علیہ السلام نے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، پھر نبی علیہ السلام نے ان کے ساتھ ایسی محبت کی زندگی گذاری اور انھوں نے نبی علیہ السلام کے ساتھ ایسی وفاداری کی زندگی گذاری کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو اللہ کے حبیب ﷺ ان کو بعد میں بھی یاد کرتے تھے، آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ خدیجۃ الکبریٰؓ کی بہن ملنے کے لئے آئیں، نبی علیہ السلام نے آواز سنی تو فرمایا کہ مجھے خدیجۃ کی سی آواز آرہی ہے، عائشہؓ نے بتایا کہ ان کی بہن ملنے کے لئے آئی تھیں، تو نبی علیہ السلام کی مبارک آنکھوں میں آنسو آگئے، عائشہؓ نے کہا کہ آپ اس بوڑھی عورت کو کیوں اتنا یاد کرتے ہیں؟ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا عائشہ! جب لوگ میرے دشمن تھے اس وقت وہ میری اپنی تھی، وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، مجھ پر اعتماد کرتی تھی، مجھے تسلی دیتی تھی، مجھے دعائیں دیتی تھی، عائشہ! جب لوگوں کے دلوں میں ظلمت تھی تو اس کے دل میں ایمان کا نور تھا، عائشہ! اللہ نے میرے دل میں ان کی محبت ڈال دی، میں اس معاملہ میں مجبور ہوں۔ سبحان اللہ! اگر خاوند ایسی محبت عورت کو دے تو پھر عورت اپنے گھر کو ضرور آباد کرے گی۔

پانچویں چیز تھی validation حقوق تسلیم کرنا، بعض مرتبہ عورت سے کوئی کام غلطی کا بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی انسان ہے، البتہ اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نبی علیہ السلام کی خاص عادت مبارکہ تھی کہ آپ بات کو جو معمولی ہوتی تھی اس کو ڈالیوٹ (ہلکا) کردیتے تھے، اس کا بتنگڑ نہیں بننے دیتے تھے، آپ ذرا غور کیجئے کہ نبی علیہ السلام عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ میں ہیں اور اس وقت ایک دوسری ام المومنین کھانے کی چیز بھیج دیتی ہیں، تو عائشہؓ نے بے دلی کے ساتھ وہ چیز لینے کے لئے جو ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ برتن ہی گر کر کے ٹوٹ گیا، تو نبی علیہ السلام نے فرمایا: ''غارت امکم'' تمہاری ماں کو غیرت آگئی، یہ

کہہ کر بات کو وہیں پہ سمیٹ دیا، ہم ہوتے تو بات کا بتنگڑ ہی بنا دیتے۔

چھٹی چیز ہے re-assurance یقین دہانی۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے عائشہؓ کو ایک لمبا واقعہ سنایا، اس محفل میں تو نہیں لیکن انشاء اللہ کل کی محفل میں آپ کو وہ واقعہ بھی سنا دیں گے، اس کو کہتے ہیں حدیث ام زرع، گیارہ عورتوں کی باتیں نبی علیہ السلام نے سنائیں کہ انھوں نے اپنے خاوندوں کے بارے میں یہ یہ کہا، اخیر میں کہا کہ ان میں سب سے اچھا ابوزرع تھا جو ام زرع کے ساتھ بہت محبت کرتا تھا اور یہ پورا واقعہ سنا کے اللہ کے حبیب ﷺ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ عائشہ! جتنا ابوزرع ام زرع کے ساتھ اچھا تھا، میں تمہارے ساتھ اس سے بھی زیادہ اچھا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ اس نے تو بیوی کو طلاق بھی دے دی تھی، میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا، اس کو re-assurance کہتے ہیں، یہ جس عورت کو مل جائے کہ میرا خاوند مجھے نہیں چھوڑے گا، مجھے تنہا نہیں ہونے دے گا، تو عورت کا دل تو پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔

اسی طرح مرد کا معاملہ دیکھ لیجئے کہ مرد کو trust چاہئے، اعتماد چاہئے، دیکھئے ابراہیمؑ بیوی بچے کو بیت اللہ کے پاس چھوڑ کے واپس جا رہے ہیں، کوئی آج کی عورت ہوتی تو اودھم مچا دیتی کہ آپ ہمیں چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہیں؟ کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں؟ ہمارا کون خیال کرنے والا ہوگا؟ رونا دھونا شروع کر دیتی، مگر سیدہ ہاجرہؓ نے صرف اتنا پوچھا کہ اللہ کے لئے آپ ہمیں چھوڑ کے جا رہے ہیں؟ انھوں نے سر ہلا دیا، حضرت ہاجرہؓ نے کہا تب اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ تو دیکھئے خاوند کے عمل پر trust کرنا یہ ان کی شان ہوتی ہے۔

نبی علیہ السلام نے آ کر کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں تو خدیجۃ الکبریٰؓ نے فوراً کہا کہ میں آپ پر ایمان لاتی ہوں، اس کو کہتے ہیں trust کرنا تو اس وقت کی بیویاں اپنے خاوندوں کو trust دیتی تھیں۔ صدیق اکبرؓ کے گھر میں نبی علیہ السلام تشریف لائے کہ ہجرت پہ جانا ہے، صدیق اکبرؓ نے گھر کا سارا مال لے لیا، ان کی بیوی کو پتہ تھا کہ پیچھے کچھ نہیں بچا، لیکن کوئی اعتراض نہیں کیا، انھوں نے اپنے خاوند کو یہ فیصلہ کر کے جانے دیا، حتی کہ بعد میں جب خسر آئے تو بچیوں نے اپنے کپڑے میں پتھر رکھ دئے اور کہا کہ ہمارے پاس بہت کچھ ہے گھبرانے کی بات نہیں، تو ٹرسٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے، تو وہ اپنے خاوندوں کے فیصلہ پہ اتنا بھروسہ اعتماد کرتی تھیں۔

دوسری چیز ہوتی ہے acceptance (قبولیت)۔ چنانچہ نبی علیہ السلام کی بڑی صاحبزادی تھیں حضرت زینبؓ ،ان کا نکاح اس وقت ہوا جب کہ نبی علیہ السلام مکہ مکرمہ میں تھے ،خدیجۃ الکبریٰؓ کی ایک بہن تھیں جن کا ایک بیٹا تھا، ابوالعاص ان کا نام تھا، یہ حضرت زینبؓ کے خالہ زاد بھائی ہوئے ،ان سے ان کا نکاح ہوا، اور یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے، چنانچہ یہ معاملہ چلتا رہا حتی کہ جب نبی علیہ السلام ہجرت کر کے آ گئے تو سیدہ زینبؓ اپنے خاوند ہی کے پاس رہیں، بدر کے میدان میں ابوالعاص مشرکین کے ساتھ مل کر لڑنے کے لئے آئے اور اللہ کی شان کہ وہ قید ہو گئے، جب بدر کے قیدیوں کو چھڑوانے کے لئے مشرکین نے فدیہ کا مال بھیجا تو زینبؓ کے پاس ایک ہار تھا، قلادہ تھا، انھوں نے اپنا وہ ہار ابوالعاص کے فدیہ میں بھیجا، جب وہ نبی علیہ السلام کے سامنے آیا تو آپ نے پہچان لیا کہ یہ تو وہ ہار ہے جو سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ نے شادی کے وقت اپنی بیٹی کو دیا تھا، جب وہ ہار اللہ کے محبوب ﷺ کے سامنے آیا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے، فوت ہوئی بیوی یاد آئیں، آپ نے صحابہ کو کہا کہ اگر آپ لوگ مشورہ دیں تو میں ان کو بھی آزاد کر دیتا ہوں اور یہ ہار بھی واپس کر دیتا ہوں، صحابہ نے کہا کہ بہت اچھا، اب ابوالعاص آزاد بھی ہو گئے اور ان کو ہار بھی مل گیا، اس کی وجہ سے ان کے دل میں نبی علیہ السلام کی ایک محبت آ گئی، جب وہ واپس لوٹے تو اس دوران نبی علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ واپس جاؤ تو میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دینا، انھوں نے وعدہ کر لیا، چنانچہ سیدہ زینبؓ نبی علیہ السلام کی خدمت میں آ گئیں، واقعہ کی تفصیل تو اس وقت نہیں کر سکتے ،اب ایک مرتبہ ابوالعاص شام تجارت کے لئے گئے، لوگوں کے بھی بہت سارے مال اس میں شامل تھے ، وہ تجارتی قافلہ لے کے واپس آ رہے تھے کہ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ ان کا مقابلہ ہو گیا، اس موقع پہ صحابہ نے ان سے مال چھین لیا، اب جب مال چھین لیا تو ان کو احساس ہوا کہ میری ذمہ داری ہے، لوگ مجھ سے مانگیں گے اور مال مجھ سے چھن لیا گیا تو وہ مدینہ آ گئے، جب مدینہ آ گئے تو زینبؓ سے انھوں نے contact (رابطہ) کیا، اب ذرا غور کیجئے کہ نبی علیہ السلام کو پتہ چلا کہ ابوالعاص آئے ہیں تو حدیث مبارک کے الفاظ ہیں ''اکرمی مثواہ'' کہ زینب! اپنے خاوند کا خیال رکھنا، جب کہ وہ مشرک ہے، ابھی وہ کافر ہے، او رمشرک اور مسلمان عورت کے نکاح کا جو مسئلہ تھا ابھی اس کی آیتیں نہیں اتری تھیں، یہ اس سے پہلے کی بات ہے، تو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا خیال رکھنا، انھوں نے کہا اللہ کے حبیب ﷺ وہ تو مال کے لئے یہاں آئے ہیں؟ فرمایا: مال کے لئے آئے ہیں مگر آنے والے کے ساتھ اچھا برتاؤ تو کیا جاتا ہے، چنانچہ ان

کے کھانے پینے کا پورا انتظام کیا گیا اور نبی علیہ السلام نے پھر صحابہ کو بلایا اور کہا کہ اگر آپ لوگ ان کا مال واپس کر دیں تو بہت اچھی بات ہوگی، اس وقت نبی علیہ السلام نے پہلے ابوالعاص کا شکریہ ادا کیا کہ ابوالعاص! میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دینا، آپ نے اس کو میرے پاس بھیج دیا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور پھر فرمایا کہ تمہارا مال میں تمہیں واپس کر رہا ہوں، ابوالعاص کے دل پہ اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس مال کو لے کر وہ مکہ مکرمہ گئے اور لوگوں کو کہا کہ تم اپنے اپنے مال سب مجھ سے لے لو، جب سب کے مال واپس کر دئے تو کہنے لگے سنو! میں کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو رہا ہوں۔ تو دیکھئے کہ سیدہ زینبؓ نے اپنے خاوند کے ساتھ کتنا acceptance کا معاملہ کیا۔

تیسری چیز ہے appreciation (پسندیدگی کا اظہار) نبی ﷺ عائشہؓ کو فرماتے ہیں کہ عائشہ! تم مجھے مکھن اور کھجور کو ملا کے کھانے سے زیادہ پسندیدہ ہو، وہ فوراً بولیں کہ اے اللہ کے حبیب ﷺ ! آپ مجھے مکھن اور شہد کو ملا کے کھانے سے زیادہ پسندیدہ ہیں، تو نبی علیہ السلام مسکرائے، فرمایا عائشہ! تمہارا جواب بہت اچھا ہے تو appreciate کرنا، اپنے خاوند سے محبت کا اظہار کرنا یہ عورت کے ذمہ بھی ہوتا ہے۔

چوتھی چیز ہے admiration (تعریف کرنا) چنانچہ عائشہؓ نبی علیہ السلام کی کتنی تعریفیں کرتی تھیں مشہور اشعار ہیں۔ لناشمس و للآفاق شمس۔۔۔۔۔۔۔

اے آسمان! ایک تیرا سورج ہے، ایک میرا سورج ہے، مگر فرق یہ ہے کہ تیرا سورج دن میں طلوع ہوتا ہے، میرے یہاں سورج عشاء کے بعد طلوع ہوتا ہے، مگر اے آسمان! ایک دن آئے گا کہ تیرے سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی، جو میرا سورج ہے اس کی روشنی وقت کے ساتھ بڑھتی جائے گی اور اللہ رب العزت کے یہاں و للآخرۃ خیر من الاولی کی خوشخبری مل گئی۔

پانچویں چیز ہے approval (منظوری)، ذرا غور کیجئے کہ حضرت علیؓ فاطمۃ الزہراءؓ روزہ رکھتے ہیں، تین دن کھانا بنتا ہے اور تینوں دن علیؓ وہ کھانا اٹھا کے مانگنے والے کو دے دیتے ہیں، اب آج کی بیوی ہوتی تو ایک جنگ شروع ہو جاتی کہ تین دن روزے سے اور تینوں دن علیؓ نے افطار کے وقت جو روٹی تھی وہ سائل کو دے دی، پانی پی کے سیدہ فاطمۃ الزہراء روزہ رکھتی رہیں، انھوں نے خاوند کے عمل پہ اعتراض نہیں کیا، اس کو approval نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

پھر encouragement ہے جس کو حوصلہ افزائی کہتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پہ نبی علیہ السلام غمزدہ تھے کہ میں نے لوگوں کو کہا کہ جانور ذبح کریں مگر لوگوں کو بات ہی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، تو ام سلمہؓ نے کہا اے اللہ کے نبی! فکر نہ کیجئے، یہ آپ کے غلام پریشان ہیں کہ ہم عمرہ کئے بغیر واپس کیسے جائیں، آپ اپنے جانور ذبح کریں، جو آپ کریں گے یہ خدام اور یہ عشاق وہی کریں گے، چنانچہ نبی علیہ السلام نے اونٹ ذبح کیا، صحابہؓ نے بھی اپنے جانوروں کو ذبح کیا اور آگے چلے۔ تو دیکھئے بیوی نے ان کو encourage کیا یا نہیں؟

ایک صاحب بنگلہ دیش سے اس وقت کراچی اترے کہ جب ملک تقسیم ہوا اور وہاں ان کے شاید کچھ ساٹھ کے قریب پٹرول پمپ تھے، اب سوچئے کہ جس بندے کے ۶۰ پٹرول پمپ ہوں، اَربوں کا مالک بندہ تھا اور وہ صرف اس حال میں یہاں اترا کہ اس کی بیوی کے سر پر دوپٹہ تھا اور کچھ نہیں تھا، اس کے ذہن میں کتنا بڑا صدمہ تھا، وہ اپنا واقعہ سنانے لگا کہ میں اپنے بھائی کے گھر آیا، میرے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا مشکل تھا کہ اتنا کچھ میرا ایک دن میں چلا گیا، مگر میری بیوی سمجھ دار تھی، دسترخوان پہ کھانا کھانے بیٹھتے تو وہ بات شروع کردیتی کہ میں عورت ذات ہوں، میں پریشان ہوجاتی ہوں، میرے خاوند کو تو اللہ نے کیا سونے کا دل دیا ہے، اتنا بڑا ان کا نقصان ہوگیا، انھوں نے تو ہاتھ کی میل بنا کے اس کو اتار دیا، وہ کہتے کہ میں حیران ہوتا کہ میری بیوی ایسی باتیں کررہی ہے، میں اپنا دل بڑا کرتا اور بڑا کرتا، بیوی تنہائی میں مجھے کہتی کہ دیکھو رزق تو اللہ کو دینا ہے، جو اللہ وہاں رزق ہمیں دے رہا تھا وہی اللہ یہاں ہمیں دے گا، آپ بالکل پریشان نہ ہونا، غربت کے ایام ہیں میں گذارا کرلوں گی، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ انھوں نے اپنے بھائی سے قرض لے کے ایک ٹرک کرایہ کا چلانا شروع کیا، اللہ نے چند سالوں میں اتنی برکت دی کہ دو سو ٹرکوں کی کمپنی کا اس کو مالک بنادیا، وہ اپنی بیوی کا واقعہ سناتے تھے اور کہتے تھے کہ میں بیوی کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ لہٰذا بیوی کو چاہئے کہ اپنے خاوند کی ایسے موقع پہ جب کہ خاوند کو اس کی ضرورت ہوتی ہے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے جو کچھ کرسکتی ہو کرے۔

ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے کا ایک آسان اصول

اور ان سب کا جو اصول ہے وہ یہ کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات ایسی ہیں کہ terminology نہ بھی آتی ہو مگر عورت کو وہ سب کچھ ملتا ہے جو اس کو چاہئے ہوتا ہے، میاں بیوی دونوں شریعت والی زندگی

کو اپنالیں، کسی terminology کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں، خود بخود خاوند بیوی کو وہ دے گا جس کی اس کو ضرورت ہے، بیوی خاوند کو وہ دے گی جس کی اس کو ضرورت ہے۔ آج شادیاں کرتے ہیں خوبصورتی کے پیچھے، تو خوبصورتی تو کسی کو کچھ نہیں دے سکتی، یاد رکھیں! شادی کے پہلے دن عورت کی شکل دیکھی جاتی ہے، پھر اس کے بعد پوری زندگی عورت کی عقل دیکھی جاتی ہے۔ اور نبی علیہ السلام کی ایک حدیث مبارک سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مال کی خاطر شادی کرنا، خاندان کی خاطر شادی کرنا، حسن کی خاطر شادی کرنا، یہ سب بعد کی باتیں ہیں، اصل چیز تو نیکی اور دینداری ہے، اس کی بنیاد پہ شادی کرنی چاہئے۔ آج ہم نبی علیہ السلام کی سنتوں کو چھوڑتے ہیں اور مصیبتوں میں پڑ جاتے ہیں، اگر کوئی اللہ کا بندہ ہوگا اور اس کے دل میں خوف خدا ہوگا تو وہ بیوی کو کیوں رلائے گا؟ وہ بیوی کو کیوں پریشان کرے گا؟ اور جس کا محبت کرنے والا خاوند ہو اس کا رنگ گورا ہے، کالا ہے، وہ غریب ہے یا امیر ہے، وہ چھوٹے خاندان کا ہے یا بڑے خاندان کا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

نبی علیہ السلام کے ایک صحابی تھے، جن کا نام تھا سعدؓ، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، ایک مرتبہ نبی علیہ السلام نے ان سے پوچھ لیا کہ شادی کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا کہ میری شادی اس لئے نہیں ہوتی کہ میرا رنگ کالا ہے، اور میں غریب ہوں، نبی علیہ السلام نے پوچھا کوئی رشتہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ میری cousin (چچا زاد) ہے، جو بہت خوبصورت ہے، امیر گھرانے کی ہے، مگر وہ لوگ مجھے رشتہ نہیں دیتے، تو نبی علیہ السلام نے کہا جاؤ اس کے والد کو بتاؤ کہ میں نے تمہارے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ کسی شاعر نے اس واقعہ کو اشعار میں کہا، آپ ذرا یہ اشعار بھی سن لیجئے کہ اس وقت کی عورتیں کس طرح دین کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتی تھیں!!

ایک بندہ سعد نامی آپ کا اصحاب تھا — رنگ کالا اس کا تھا اور نقد میں نایاب تھا
ایک دن دریائے رحمت آ گیا یوں جوش میں — سعد کو بیٹھے بٹھائے لے لیا آغوش میں
سعد تو نے اپنی شادی آج تک کی نہیں — سعد بولا رشتہ کوئی کالے کو دیتا نہیں
ایک لڑکی خود میرے چچا کے یہاں موجود ہے — میں تو کوشش کر چکا لیکن وہاں بے سود ہے
جب بھی جاتا ہوں وہاں لے کر میں خود اپنا پیام — دھکے ملتے ہیں مجھے سنتا ہوں باتیں بے لگام
بدشکل بدرنگ ہونا اس میں میرا چارہ کیا — میں نے ہے وہ رنگ پایا جو مجھے رب نے دیا

کالے گورے کا خیال آتے ہی جذبہ آگیا — جوش میں آکر اسی دم آپ نے فرمادیا
سعد میں نے آج تیرا عقد اس سے کردیا — اپنے چچا جی کو جاکر یہ خبر جلدی سنا
سعد نے سن کر نبی کی گفتگو، پرواز کی — اپنے چچا جان کے دروازے پر آواز دی
سن کے یہ آواز وہ جلدی سے باہر آگئے — سعد کی اس بات سے دل میں بہت گھبرا گئے
بولے تو ہے رنگ کا کالا اور ہے مفلس غریب — میں تجھے لڑکی دوں اپنی یہ کہاں تیرا نصیب
سعد کے چچا عمرو بن وھب بولے بے حجاب — بھاگ جا در سے میرے ورنہ کروں گا میں خراب
سعد بولے اپنی مرضی سے تو میں آیا نہیں — مصطفی نے بھیجا تھا اور اب بھی جاتا ہوں وہیں
سعد تو یوں در سے واپس آگئے سوئے جناب — اور گئے اندر چچا کھاتے ہوئے کچھ پیچ وتاب
لڑکی ان کی سن چکی تھی سعد کے سارے جواب — بولی ابا خیر تو ہے کیوں تھا غصے کا خطاب
باپ بولا سعد حبشی میرے در پر آیا تھا — اور تجھ سے شادی کا پیغام مجھ تک لایا تھا
رنگ کا ہے کالا وہ اور مفلس ومحتاج بھی — میری عزت اور دولت کی نہ رکھی لاج بھی
چاندسی بیٹی اسے دے دوں یہ تو ممکن نہیں — وہ تو کوڑھی داغ داماد ہوسکتا نہیں
لڑکی بولی خود پیام عقد لے کے آیا تھا — یا کسی نے بھیجا تھا اور بن کے قاصد آیا تھا
باپ بولا خود سے میں آیا نہیں کہتا تھا وہ — سرور کونین نے بھیجا ہے مجھ کو بیٹی دو
سن کے بس اس بات کو لڑکی تو وہ چلا اٹھی — کیا غضب کی بات ابا تم نے آج اس سے کہی
کب میں کہتی ہوں کہ اس کے رنگ کالے کو تو دیکھ — میں تو کہتی ہوں کہ اس کے بھیجنے والے کو دیکھ
میں نے مانا کالا ہے وہ حسن میں بھی ماند ہے — بھیجنے والا تو لیکن چودھویں کا چاند ہے
تیری بیٹی اس کے کالے رنگ پر مسرور ہے — کالی کملی والے کی مرضی اسے منظور ہے

اگر ایسی بیویاں ہوں جو کالی کملی والے کی مرضی کو دیکھ کر زندگی گذارنے والی ہوں تو سوچئے کہ گھر جنت کے نمونے بن جائیں گے۔ اللہ رب العزت ہمیں نیکوکاری پرہیزگاری کی زندگی نصیب فرمائے۔

☆☆☆

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ✶

مسئلۂ تقلید

[عزیز مکرم مولانا محمد یحییٰ نعمانی کی ایک نئی کتاب ''تقلید اور مسلکی اختلاف کی حقیقت'' شائع ہوئی ہے —— ذیل میں جو مضمون نذر ناظرین کیا جارہا ہے وہ دراصل اسی کتاب کے مقدمہ کے طور پر لکھا گیا ہے، اس سے نفس مسئلہ پر روشنی بھی پڑتی ہے اور اس کتاب کی خصوصیت وافادیت کے بارے میں ہمارے دور کے ایک ممتاز فقیہ کی گراں قدر رائے بھی معلوم ہوتی ہے۔—— مدیر]

دین کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول پر ہے، کتاب اللہ کی نسبت رسول اللہ ﷺ کو دو بنیادی ذمہ داریاں سونپی گئیں، ایک: قرآن مجید کو انسانیت تک پہنچانا ''وما علینا الا البلاغ المبین (یٰسین: ۱۷) دوسرے: قرآن مجید کا بیان اور اس کی تشریح وتوضیح ''لتبین للناس ما نزل الیھم'' (سورۂ نحل: ۴۴) رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول وفعل کے ذریعہ قرآن مجید کی تشریح فرمائی ہے، اسی کو ''حدیث'' اور ''سنت'' کہتے ہیں، پھر جیسے سنت قرآن مجید کا بیان ہے، قریب قریب اسی طرح آثار صحابہ سنت نبوی کا بیان ہیں؛ اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الرشدین'' (ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ، حدیث: ۴۶۰۷) اور یہ بھی ہدایت دی کہ میرے بعد بہت سارے اختلافات سامنے آئیں گے، اس وقت وہ لوگ حق پر ہوں گے، جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر کاربند رہیں: ''ما انا علیه و اصحابی''۔ (ترمذی، کتاب الایمان، باب افتراق الامۃ، حدیث: ۲۶۴۱)

قرآن مجید تو تمام تر تواتر اور یقینی ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے؛ لیکن حدیثیں مختلف درجات کی حامل ہیں، ان میں متواتر بھی ہیں، جو یقین کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں اور ہر زمانہ میں اتنی بڑی جماعت قول یا عمل کے ذریعہ اس کو نقل کرتی آئی ہے کہ بظاہر ان کا جھوٹ پر متفق ہوجانا ناقابل تصور ہے، اور اس سے کم درجہ کی روایتیں بھی ہیں؛ اس لئے تمام احادیث وآثار ثبوت کے اعتبار سے ایک درجہ کے نہیں ہیں، پھر جو معتبر طور پر ثابت ہیں، ان میں بھی بعض دفعہ ظاہری طور پر تعارض پایا جاتا ہے، اگرچہ حقیقتاً رسول اللہ ﷺ کے قول

✶ بانی وناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد وسیکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

وفعل میں تعارض نہیں ہوسکتا، یہ تعارض اس لئے نظر آتا ہے کہ مختلف اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف عمل کئے یا الگ الگ باتیں ارشاد فرمائیں، یا اس لئے کہ بعض احکام آپ نے خصوصی حالات کی مناسبت سے دیئے؛ لیکن راوی نے اس کو مطلق نقل کردیا، بعض احکام مستحب اور عزیمت کے درجہ میں تھے اور بعض رخصت واباحت کے درجہ میں؛ لیکن نقل وروایت میں اس کی وضاحت نہیں ہوسکی، بعض احکام منسوخ بھی ہوئے؛ کیونکہ بہ تقاضائے مصلحت کچھ مسائل میں ابتداءً سختی برتی گئی اور بعد کو نرمی کا پہلو اختیار کیا گیا، اور بعض میں اس کے برعکس پہلے نرم احکام دئے گئے اور پھر سخت احکام؛ چونکہ متعین طور پر ان مختلف احکام کی تاریخیں معلوم نہیں ہیں؛ اس لئے ناسخ ومنسوخ کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے ان میں تعارض محسوس ہوتا ہے، اسی طرح جو نصوص قطعی ہیں، یا معتبر طور پر منقول ہیں، ان میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے بعض اوقات ان میں ایک سے زائد معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔

ان مسائل کو حل کرنے میں مجتہد کو جو آبلہ پائی کرنی پڑتی ہے اس کو سمجھنے کے لئے جاننا چاہئے کہ مجتہد کو کم سے کم یہ کام کرنے پڑتے ہیں:

(الف) اس بات کی تحقیق کہ یہ نصوص مستند طور پر ثابت ہیں یا نہیں؟ اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے؛ کیونکہ احکام سے متعلق مختلف درجات کی احادیث کی تعداد کم وبیش چار ہزار سے زیادہ ہے، اتنی ساری احادیث کی سند کی تحقیق، راویوں کے احوال کی تلاش اور پھر درایت اور واقعاتی پہلو سے اس کے معتبر اور نا معتبر ہونے کا فیصلہ کرنا، یہ سب نص کی تحقیق میں داخل ہے۔

(ب) مجتہد کا دوسرا کام متعارف روایات میں تطبیق وترجیح، نیز یہ معلوم کرنا ہے کہ اس میں سے کوئی نص منسوخ تو نہیں ہے، اس کے لئے نصوص کے وسیع ذخیرہ پر عمیق نظر اور شریعت کے مزاج ومذاق سے آگاہی ضروری ہے۔

(ج) مجتہد کا تیسرا کام یہ ہے کہ نصوص میں جو کلمات وارد ہوئے ہیں، وہ اس کا مفہوم متعین کرے، اس میں دونوں باتیں شامل ہیں: یہ بھی کہ الفاظ کا لغوی معنی متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس سے ظاہری معنی ہی مراد ہیں یا ظاہر اور متبادر معنی سے الگ اور کوئی معنی مراد ہے؟ کیونکہ بعض دفعہ کوئی بات بطور تشبیہ کے کہی جاتی ہے، بعض اوقات لفظ عام ہوتا ہے، مراد خاص ہوتی ہے، بعض دفعہ ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں اور قرائن سے معلوم کرنا پڑا ہے کہ یہاں لفظ مشترک کا کون سا معنی مراد ہے؟ دوسرے: تعبیر کے

لب ولہجہ سے یہ بات متعین کرنی پڑتی ہے کہ شارع کا مقصود کیا ہے؟ مثلاً: امر وجوب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اباحت کے لئے بھی اور استحباب کے لئے بھی، اس کے علاوہ ایک صورت ''امرارشاد'' کی بھی ہوتی ہے، نص کے لب ولہجہ اور قرائن کی روشنی میں یہ بات متعین کی جاتی ہے کہ یہاں کونسا معنی مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کے لئے عربی لغت، عربی زبان کے قواعد اور اصول فقہ پر وسیع نظر ضروری ہے۔

(د) جن مسائل میں کوئی نص موجود نہ ہو ان میں مجتہد کو دوسرے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے قیاس سے کام لینا ہوتا ہے اور قیاس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کتاب وسنت میں آنے والے حکم کی علت دریافت کی جائے، اور پھر جو مسائل درپیش ہیں ان پر اس علت کو منطبق کیا جائے، اس کے لئے گہری بصیرت اور خداداد ذہانت مطلوب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام عوام تو کیا عام علماء بھی نہیں کرسکتے، بلکہ اس کے لئے غیر معمولی علم بھی مطلوب ہے اور خشیت الٰہی بھی، علم اس لئے کہ نادانستہ غلطیوں سے بچا جاسکے اور خشیت اس لئے کہ دانستہ غلطیوں سے بچا جاسکے، کیونکہ اگر انسان خشیت الٰہی سے خالی ہو تو احکام شریعت کی رہنمائی میں اجتہاد کے نام پر اپنی خواہش کو بھی شامل کرسکتا ہے اور بعض دفعہ حکومت یا کسی اور طبقہ کے جبر ودباؤ اور تحریض سے بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ اس مختصر وضاحت سے بھی کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اجتہاد کتنا دشوار کام ہے اور اس کے لئے کتنی غیر معمولی صلاحیت درکار ہے؟ اسی بنا پر تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے گذرے ہیں جن کو امت نے اس کا اہل تسلیم کیا ہے، یہاں تک کہ صحابۂ کرام جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تھے ان میں بھی علامہ ابن قیمؒ نے صرف ۱۳۰ شخصیتوں کو فقیہ یا مجتہد شمار کیا ہے، تاہم یہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ ملت اسلامیہ کی بہترین ذہانتیں اجتہاد اور فقہ کی آبیاری میں خرچ ہوئی ہیں۔

اجتہاد اور تقلید دونوں کی ضرورت ہے:

جیسے اجتہاد ایک ضرورت ہے، ویسے ہی جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کے لئے تقلید بھی اسی طرح ضروری ہے، کیونکہ ناواقف حضرات کے لئے خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فاسئلوا اھل الذکر'' (النحل: ۴۳) یہاں ذکر سے علم مراد ہے، (تفسیر ابن کثیر: جلد ۵، صفحہ: ۷۲) یعنی جو لوگ خود احکام شرعیہ سے واقف نہ ہوں وہ اہل علم سے دریافت کرکے ان پر عمل کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم'' (النساء: ۵۹) یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ''اولی الامر'' سے مراد

اصحاب فقہ اور اصحاب دین ہیں: ''اهل الفقه و الدين'' (مستدرک حاکم: ۱/۱۲۳، کتاب العلم، باب فی توقیر العالم، حدیث: ۴۲۳) اور یہ بات بالکل انسانی عقل اور فطرت کے بھی مطابق ہے کہ جو لوگ ناواقف ہوں وہ واقف شخص سے دریافت کرکے اس پر عمل کریں، ہم لوگ شب و روز علاج کے معاملہ میں ڈاکٹر پر، مکان اور مشنریز کے لئے انجینئرز پر اور قانونی مشورہ کے لئے وکلاء پر بھروسہ کرتے رہتے ہیں، تو جیسے زندگی کے دوسرے مسائل میں ہم تقلید پر کاربند ہیں یا جیسے راوی کے معتبر یا نامعتبر ہونے کے سلسلہ میں ماہرین اسماء الرجال اور محدثین کی آراء پر بھروسہ کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح احکام شرعیہ میں بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے سے زیادہ صاحب علم اور احکام شریعت سے باخبر شخص کی رائے پر عمل کرے، اسی کا نام ''تقلید'' ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تیسری صدی ہجری کے بعد ہمیں کوئی ایسی شخصیت نہیں ملتی کہ جس نے تمام یا معتد بہ مسائل کے بارے میں خود اجتہاد کیا ہو، امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ (متوفی: ۳۱۰ھ) آخری شخصیت ہیں جن کو مجتہد شمار کیا گیا ہے، اس کے بعد بڑے بڑے اہل علم آئے، لیکن انھوں نے اجتہاد کے بجائے تقلید کا راستہ اختیار کیا اور اگر کسی نے اجتہاد بھی کیا تو دو چار مسائل میں، اگر اکا دکا کسی نے اپنے مجتہد ہونے کا دعوی بھی کیا تو امت میں اسے قبول حاصل نہ ہوسکا، یہاں تک کہ خود محدثین جیسے امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، بیہقی، دارقطنی، طحاوی اور زیلعی جیسے اہل علم جن کے پاس حدیث کا وافر ذخیرہ موجود تھا، انھوں نے بھی اجتہاد کے بجائے اتباع اور تقلید ہی کو اپنے لئے بہتر تصور کیا، ان کا یہ عمل کسل مندی یا اللہ اور رسول کو چھوڑ کر کسی اور شخص کی پیروی کے جذبہ پر مبنی نہیں تھا، بلکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ کوئی بھی فن بتدریج ترقی کرکے اوج کمال تک پہنچ جاتا ہے، پھر اس میں کہیں کہیں جزوی خدمت کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے عربی قواعد ہی میں نحو و صرف کے علوم ہیں کہ یہ اپنی پختگی اور ترقی کا سفر پورا کرچکے ہیں، اب آج اگر اس میں کوئی نئی بات کا اضافہ نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لوگوں نے اس فن میں جمود اختیار کرلیا ہے، یہ جمود نہیں ہے، بلکہ تکمیل ہے، اسی طرح بعد کے اہل علم نے جو تقلید کا راستہ اختیار کیا وہ یہی محسوس کرکے کہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق جو رہنمائی ہوسکتی تھی اور جن مختلف آراء کا امکان تھا، نیز مختلف صحابہ کے جو فتاوی تھے، سلف صالحین نے ان سب کو اپنے اجتہاد میں سمو دیا ہے، اب از سر نو اس کام کو کرنا ایک عبث کام ہوگا۔

غرض کہ نفس تقلید کے بارے میں تو کسی کلام کی گنجائش نہیں، شبہہ ''تقلید شخصی'' کے بارے میں پیدا ہوتا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو خود عہد نبوی میں تقلید شخصی کی مثالیں موجود ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف

علاقوں میں صحابہ کو بھیجتے اور اس علاقے کے لوگوں کو ہدایت ہوتی کہ وہ ان کی تعلیمات پر عمل کریں، جیسے حضرت مصعب بن عمیر کو مدینہ بھیجا گیا، حضرت علی اور معاذ بن جبلؓ یمن بھیجے گئے، عہد فاروقی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو خاص طور پر کوفہ بھیجا گیا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود کو جو پسند ہو میں نے اپنی امت کے لئے وہ پسند کیا: ''رضیت لامتی مارضی به ابن ام عبد'' (مستدرک حاکم، کتاب معرفۃ الصحابہ، حدیث: ۵۳۸۷) ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگ ان ہی کے فتوے پر عمل کرتے تھے اور اس لئے صحابہ وتابعین حضرت عبداللہ بن مسعود کی رائے کو خصوصی اہمیت دیتے تھے، یہ سب تقلید شخصی ہی کی صورتیں ہیں، بعد کو شخصی تقلید کو علماء نے واجب قرار دیا، لیکن بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانوی: یہ واجب لغیرہ ہے، یعنی تقلید شخصی بذات خود واجب نہیں ہے، سد ذریعہ کے طور پر واجب ہوئی ہے، کیونکہ فقہاء کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف رائے ہے، ان میں بعض رائیں انسان کے لئے سہولت کا باعث ہیں، لیکن وہ قرآن وحدیث سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور انسانی کوشش میں اس طرح کی خرابی کا پایا جانا اس کی عظمت یا اس کے اخلاص کے منافی نہیں ہے، اگر مختلف مسائل میں تقلید کی اجازت دی جاتی تو لوگ قرآن وحدیث کی اتباع کے بجائے خواہش نفس کی اتباع میں گرفتار ہوجاتے، اور مختلف فقہاء کی اس رائے کو لے لیتے جو ان کے مفاد کے مطابق ہوتی۔ اس لئے یہ بات بہتر سمجھی گئی کہ تمام مسائل میں کسی ایسے فقیہ کی تقلید کی جائے جس نے اپنے اجتہاد میں زندگی کے بیشتر مسائل کا احاطہ کیا ہو، تاکہ اتباع ہوئی کا ذریعہ بند ہوجائے، اور لوگ کتاب وسنت کی پیروی پر قائم رہیں۔

البتہ پورے عہد تقلید میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا، ایک یہ کہ جو نئے مسائل پیدا ہوں ان میں اجتہاد کیا جائے، تاکہ امت کسی بھی مسئلہ میں تاریکی میں اور شریعت کی روشنی سے محروم نہ رہے، اسی کو فقہ کی اصلاح میں ''تخریج مسائل'' یا ''تحقیق مناط'' کہتے ہیں اور علماء متفق ہیں کہ یہ اجتہاد کی ایسی صورت ہے جو قیامت تک باقی رہے گی، یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا کہ اب مجتہد نہیں رہ گئے تو فلاں فلاں مسائل کیسے حل ہوں گے؟ دوسرے چونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی اتباع ہی مقصود ہے اور ہر اجتہاد میں خطا کا احتمال موجود ہے، اس لئے اگر امام کی کوئی رائے واضح طور پر نص سے متعارض ہو یا عصری تبدیلیوں کی وجہ سے احتیاط کے خلاف ہوگئی ہو یا شریعت کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ نہ ہو، تو وہاں امام کے قول کو ترک کیا جاتا ہے، مذاہب اربعہ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، لیکن یہ حقیر صرف فقہ حنفی سے

اس کی ایک ایک مثال عرض کرنے پر اکتفاء کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دارالحرب میں ربا جائز ہے ،لیکن بہت سے فقہائے احناف خاص کر علمائے ہند نے اس رائے پر فتوی نہیں دیا، کیونکہ یہ رائے صحیح اور صریح نصوص سے متعارض ہے۔

امام ابوحنیفہ کے یہاں چہرہ اور گٹوں تک ہاتھ حصۂ ستر میں داخل نہیں ہے،لیکن متاخرین احناف نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اور فتنے کو دیکھتے ہوئے ضرورت کے مواقع کے سوا چہرہ کے چھپانے کو بھی واجب قرار دیا۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر کوئی مرد لاپتہ ہوجائے تو عورت کو اس کے ہم عصر لوگوں کے انتقال تک انتظار کرنا چاہئے ،جیسا کہ حضرت علی کا فیصلہ ہے ،لیکن بعد کے فقہاء نے دیکھا کہ نکاح کا ایک اہم مقصد عفت وعصمت کی حفاظت ہے اور اتنا طویل انتظار عورت کی عزت وآبرو کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے، اس لئے انھوں نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر مبنی امام مالکؒ کے فیصلہ کو قبول کیا اور اسی پر فتوی دیا۔

اس طرح کی سیکروں مثالیں فقہاء کے یہاں موجود ہیں غالبا اسی بنیاد پر ایک مستقل ''اصول خروج من الخلاف'' کا تمام فقہاء کے یہاں پایا جاتا ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں ایسے طریقے پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے درست ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہو، اس میں اصل مقصود فقہاء کے اختلاف سے بچنا نہیں ہے، بلکہ ان نصوص کی مخالفت سے بچنا ہے جس پر مختلف فقہاء نے اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے۔

تقلید کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ''جس شخص کی بات شریعت میں دلیل کا درجہ نہیں رکھتی ہو اس کی بات کو دلیل پوچھے بغیر اس گمان کے تحت مان لیا جائے کہ اس نے قرآن وحدیث کو درست طور پر سمجھا ہے لیکن اس میں خطا کا احتمال بھی موجود ہے'' اگر چہ کہ تقلید کی تعریف میں مختلف تعبیرات اختیار کی گئی ہیں ،لیکن ان سب کا ماحصل یہی ہے گویا مقلد تین باتوں کو مانتے ہوئے کسی فتوے پر عمل کرتا ہے، اول: یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرح اس امام کی بات بذات خود حجت ودلیل نہیں ہے، دوسرے تقلید کا اصل مقصد کتاب وسنت کی پیروی ہے ،تیسرے امام مجتہد نبی کی طرح معصوم نہیں ہے ، بلکہ اس کی رائے میں خطا کا احتمال موجود ہے، اب کون دیانت دار اور منصف مزاج شخص کہہ سکتا ہے کہ تقلید کرنے والا اپنے امام کو رسول کا درجہ دیتا ہے؟ تقلید اور اجتہاد کی تعریف تو ایک علمی بحث ہے لیکن اگر آپ کسی عام آدمی سے بھی دریافت کریں کہ مثلا تم فجر میں دو رکعت سنت اور دو رکعت فرض کیوں پڑھتے ہو؟ فریضۂ فجر سے پہلے یہ دو رکعت کس کی سنت ہے؟ اور دو رکعت فرض کس نیت سے ادا کرتے ہو؟ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ دو رکعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت ہے، اوراس دورکعت فرض کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ امام ابوحنیفہ یا امام مالک کی سنت ہے یاانھوں نے حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تقلید کی حیثیت کسی ماہرفن کی رائے سے فائدہ اٹھانے کی ہے، لیکن عالم ہو یا عامی ہر ایک کا مقصود اللہ اوراس کے رسول ہی کی اطاعت ہے، اسی لئے بہت سے مقلد علماء خاص کر ہمارے علمائے دیوبند نے تقلید میں غلو اور جمود کو منع کیا ہے۔

بدگمانی اور غلط فہمی کا حال یہ ہے کہ بعض حضرات فقہ کو کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق ایک الگ شیٔ قرار دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہ کتاب اللہ اور سنت رسول سے کشید کیا ہوا عطر ہے، نہ کہ اس کے مقابل کوئی چیز، مثلا اگر کسی شخص کو نیت سے لے کر سلام تک نماز کے احکام دیکھنے ہوں تو اسے سیکڑوں حدیثیں دیکھنی ہوں گی، پھر راویوں کے حالات کھنگال کر ان کے درجات متعین کرنے ہوں گے، متعارض روایات میں ترجیح دینی ہوگی، اور نہ جانے کتنے الفاظ کی لغوی تحقیق کرنی پڑے گی، شاید اس کے لئے سالہا سال مطلوب ہوں، لیکن اگر آپ فقہ کی کتابوں میں باب صفۃ الصلوٰۃ نکال لیں تو دو تین صفحات میں آپ کو ان تمام مباحث کا نچوڑ مل جائے گا، اور نیت سے لے کر سلام تک کے تمام احکام آپ کے سامنے آجائیں گے، اس لئے انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمیں فقہاء کا ممنون وشکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے عام مسلمانوں کے لئے قرآن وحدیث پر عمل کرنے کو آسان کردیا ہے۔

رہ گیا اس تقلید شخصی کا ائمہ اربعہ میں محصور ہوجانا تو ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے کسی جگہ بیٹھ کر اس پر اتفاق کرلیا ہو، بلکہ یہ ایک غیبی فیصلہ ہے، چونکہ ان فقہاء کی آراء کتاب وسنت اور منشائے شریعت کے قریب محسوس کی گئیں اور ان کے اجتہادات زندگی کے تمام شعبوں موجود ہیں اس لئے امت میں انھیں خاص طور پر پذیرائی حاصل ہوئی، جیسے قراءت وتجوید میں قرائت سبعہ کو یا قرائت عشرہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ دوسری قراءتوں کو حاصل نہ ہوسکی، جیسے احادیث صحیحہ کے بہت سے مجموعے مرتب ہوئے، لیکن صحیحین کو جو قبول عام وتام حاصل ہوا وہ کسی اور تصنیف کے حصہ میں نہیں آیا، اسی طرح یہ ایک غیبی فیصلہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کو من جانب اللہ جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکی، اس میں کسی تعصب اور تنگ نظری کو دخل نہیں ہے، اور شاید اس کی مصلحت یہ بھی ہو کہ مذاہب اربعہ نے اجتہاد واستنباط کی مختلف جہتوں کو فقہائے صحابہ کے اکثر اقوال کو اور قیاس کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے، گویا یہ بحیثیت مجموعی پوری شریعت اسلامی کی ترجمان اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کے لئے شرح وبیان ہے اس

لئے اس پر معترض ہونا ایک طرح سے خدا کے فیصلے پر معترض ہونا ہے۔

اگر موجودہ زمانہ کے حالات کو دیکھیں تو بظاہر تقلید جیسے موضوع پر قلم اٹھانا، مناسب نظر نہیں آتا، جس پر صدیوں پہلے گفتگو ہو چکی ہے، اور جس کی بار بار وضاحت آچکی ہے۔ لیکن افسوس کہ کچھ لوگوں نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ گویا امت کا سواد اعظم تقلید کو اختیار کر کے شرک و گمراہی میں مبتلا ہے اور اس طرح بیک جنبش قلم جمہور امت کو مشرک یا گمراہ ٹھہرایا جاتا ہے، شاید اس طرح وہ ان اعدائے اسلام کے کام کو آسان کر رہے ہیں جو دنیا میں مسلمانوں کی عددی طاقت کو کم بتاتے ہیں، پھر یہ ایسی سوچ ہے جو ہماری پوری تاریخ کو مجروح کر کے رکھ دیتی ہے، اسی پس منظر میں مختلف اہل علم ایسے مسائل پر گفتگو کرنے اور لوگوں کو حقیقت حال سے واقف کرانے پر مجبور ہوئے۔

اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم اور مفید تالیف اس وقت میرے سامنے ہے!

اگر چہ کہ اس موضوع پر ایک اچھا خاصا لٹریچر اردو زبان میں موجود ہے لیکن مختلف جہتوں سے پیش نظر کتاب بالکل منفرد نوعیت کی حامل ہے اس کتاب کا اسلوب مناظرانہ نہیں بلکہ داعیانہ ہے؛ اور مؤلف کتاب نے افراط وتفریط سے بچتے ہوئے نہایت اعتدال کے ساتھ تقلید کی مشروعیت اس کی ضرورت اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، یہی داعیانہ اسلوب اور فکر ونظر کا اعتدال اس موضوع پر موجود اکثر لٹریچر سے اسے ممتاز کرتا ہے، اس میں طعن وطنز کے کانٹے چبھونے کے بجائے نصح ومحبت کے پھول نچھاور کئے گئے ہیں لیکن جو بات کہی گئی ہے وہ علم وتحقیق اور انصاف کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے اور بنیادی مصادر ومراجع سے استفادہ کرتے ہوئے کہی گئی ہے۔

مؤلف کتاب محبی فی اللہ مولانا یحییٰ نعمانی زیدت حسناتہ ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ ہیں، اس خاندان کے سرخیل عالم ربانی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا امتیازی وصف مبنی برحق افکار کی ترجمانی اور افکار باطلہ کی تردید اور کسی رورعایت کے بغیر اس پر تنقید تھا، مولانا یحییٰ نعمانی کو یہ وصف میراث میں ملا ہے، متعدد تالیفات ان کے قلم سے منظر عام پر آچکی ہیں جن میں جہاد کے موضوع پر لکھی گئی ان کی تحریر تو نہایت اہمیت کی حامل ہے، جس میں ان لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلام کے دائرے سے باہر ہیں، اور موجودہ تالیف ایک ایسی غلط فہمی کو دور کرتی ہے جو خود مسلمانوں کے بعض طبقوں میں پائی جاتی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کے قلم کو تازہ دم رکھے اور ان کے سفر علم وتحقیق کی شام دیر اور بہت دیر سے آئے۔

☆☆☆

مرحوم مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی
ترجمہ: مولوی سید عبداللہ الحسنی (علیہ الرحمۃ)

ایک عجیب وغریب تضاد
جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی

[ذیل میں مولانا محمد الحسنی مرحوم کی زندگی کے اسی آخری مضمون کا ترجمہ مولانا عبداللہ حسنی (مرحوم) کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں جس کا تذکرہ نگاہ اولیں میں آچکا ہے، حضرت والد ماجدؒ نے اس وقت جو نوٹ لکھا تھا وہ بھی بعینہٖ نقل کیا جارہا ہے —— سجاد]

[الفرقان کے گذشتہ شمارہ میں نگاہ اولیں کے صفحات میں مرحوم مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی پر جو تعزیتی نوٹ شائع ہوا ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ ان کے اس معرکۃ الآراء افتتاحیہ کا ذکر تھا جو ماہ رجب کے البعث الاسلامی میں شائع ہوا تھا، ناچیز مدیر ''الفرقان'' نے لکھا تھا کہ ''میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے ''ندائے غیب'' سمجھا اور طے کرلیا کہ اس کو اردو میں منتقل کرا کے ''الفرقان'' میں شائع کرنا ہے، میں نے ان سے اس کے ترجمہ کی فرمائش بھی کی اور انھوں نے وعدہ بھی کیا، لیکن ان کی فجائی موت نے اس کی مہلت نہ دی، اور وہ خود اس کا ترجمہ نہ کرسکے، جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کام میں نے ان کے ہونہار فرزند مولوی سید عبداللہ الحسنی کے سپرد کیا۔ خدا شکر ہے کہ انھوں نے اس کو بڑے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا اور ترجمہ وانشاء کی بڑی صلاحیت کا ثبوت دیا، یہ مضمون اس شمارہ میں شائع ہورہا ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ''اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند'' اللہ تعالی ان کی عمر اور صلاحیتوں میں برکت عطا فرمائے اور وہ اپنے خاندان اور ملت کا نام روشن کریں۔]

آج اگر کوئی سوال کرے کہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ اور اسلامی انقلاب کی سب سے اہم اور اول شرط کیا ہے؟ تو ہم پورے اعتماد ویقین کے ساتھ بلاتوقف کہیں گے کہ اس تضاد اور تناقض کو ختم کرنا جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں اور دائروں میں پایا جاتا ہے۔ اور جس نے ہماری حکومتوں، ہماری تنظیموں اور ہمارے دینی مراکز نیز ہمارے علماء وقائدین، ہمارے جوانوں وبوڑھوں، عوام وخواص حتی کہ

ہمارے وسائل وذرائع سب کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے اور اب گویا وہ تضاد وتناقض ہماری زندگی کا لازمہ اور ہماری طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، اس ''تضاد'' اور ''دوعملی'' نے ساری فکری واجتماعی اور اصلاحی کوششوں کا دروازہ بند کردیا ہے، اور ان کو لاحاصل وبے اثر بنادیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے متقابل ومتضاد عناصر نے ''بقائے باہم'' کے عصری اور ترقی یافتہ اصول پر ایک دوسرے سے سمجھوتہ کرلیا ہے، اور دونوں دوش بدوش زندگی گذار رہے ہیں، نہ ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا قرآن مجید کی تلاوت سے آغاز، عریاں ناچ، بے حیائی کے مناظر اور ہیجان انگیز گانوں سے نبرد آزما ہے، نہ یہ انتشار انگیز، ہیجان خیز پروگرام تلاوت سے الجھتے ہیں، نہ رقص وسرور کے ان پروگراموں کے آیات قرآنی کی تلاوت سے افتتاح کرنے میں لوگوں کو کوئی تضاد، بوالعجبی، بلکہ ''ستم ظریفی'' محسوس ہوتی ہے جو سراپا گوش اور محو دید افراد خاندان کے درمیان جن میں باپ بھی ہوتے ہیں اور بیٹے بھی، مائیں بھی ہوتی ہیں اور بیٹیاں بھی، کیف وطرب اور داد وتحسین کی فضا پیدا کردیتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان متضاد عناصر نے ''ناجنگ معاہدہ'' کرلیا ہے اور یہ بھی آیت قرآنی ''مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ''[1] کی ایک تفسیر وتصویر ہے۔

پھر یہ دیکھ کر انتہائی رنج وافسوس ہوتا ہے کہ یہ تضاد ہمارے اس دور میں اپنی بدترین شکل میں ان ملکوں اور علاقوں میں زیادہ نمایاں ہے اور حد کو پار کررہا ہے جو اسلام کے مقدس ومضبوط اور آہنی قلعے سمجھے جاتے تھے، اور جن سے مسلمانان عالم ہی کو نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کو اخلاق وکردار کی رہنمائی ملتی تھی اور جو توحید وسنت کے داعی وعلمبردار اور شعائر اسلام کے محافظ وپاسباں تھے، میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس موقع پر خاص طور سے اس ملک اور اس حکومت کا نام لوں جس میں اس طرح کے تضاد کا وجود ضمیر وایمان کے لئے سب سے زیادہ باعث تکلیف وآزمائش ہے، یہ وہی ملک ہے جس کا ہم مسلمانان عالم پر یہ احسان ہے کہ اسی کے طفیل ہم نے فرعونیت، فینقیت، آشوریت، برہمنیت، کسرویت، اور قیصریت کی تاریکیوں سے نجات پائی، جس نے سب سے پہلے یہ نعرہ لگایا کہ

لاکلیسا، لاسلاطین، لاالٰہ (الااللہ)

جس سے دنیا کو ایمان وتوحید اور عدل ومساوات کی دولت نصیب ہوئی، کون نہیں جانتا کہ مصر اپنے اس فرسودہ تمدن ومردہ تہذیب میں جس کی بنیاد ظلم وبربریت، طغیان وسرکشی، اور انسانیت کی تذلیل پر تھی۔ اور جس کا خمیر کبر وانانیت پر اٹھا تھا، جس نے فرعون سے أنا ربکم الاعلی کا نعرہ لگوایا، اور جس نے اپنے ہی بنی نوع، بنی اسرائیل کی گردن میں طوق اور سلاسل ڈال کر غلامی کے پھندوں میں جکڑ کر زندہ درگور

کر دیا، اُس مصر کو ایمان ویقین، توحید وسنت، خداشناسی وخودشناسی کی دولت جزیرۃ العرب ہی سے ملی تھی، اسی طرح عراق وشام، فلسطین وہندوستان اور پاکستان وغیرہ تمام ممالک اس بارے میں جزیرۃ العرب کے زیر بار احسان اور اس کے خوان کرم کے ریزہ چیں ہیں، سب کو ہدایت کا نور اور یقین کی کرن وہیں سے ملی۔

اب صورت یہ ہے کہ تمام مسلم وعرب ممالک میں یہ تضاد اپنی بدترین صورت اور ہولناک شکل میں موجود ہے لیکن جزیرۃ العرب اور گہوارۂ اسلام کا معاملہ سارے ملکوں سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے، کیونکہ جو کچھ مصر وشام میں برداشت کیا جاسکتا ہے اس قطعۂ ارضی میں نہیں برداشت کیا جاسکتا، اور جو کچھ ہم لبنان میں دیکھ سکتے ہیں وہ مصر میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے کہ ہر ایک کی تاریخ الگ ہے اور ہر ایک کا منصب ومقام جدا۔ اسی طرح ہر ملک دوسرے ملک سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ جس شدومد کے ساتھ اس مقدس سرزمین میں کتاب وسنت کی دعوت دی جاتی اور جس بلند آہنگی اور جوش وخروش سے ہر موقعہ پر اسلام کا نام لیا جاتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے اس کا وظیفہ پڑھا جاتا ہے، وہ کسی اور ملک میں موجود نہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ چند سال پہلے میں ایک مرتبہ سعودی ریڈیو سے ایک تقریر سن رہا تھا، تقریر نہایت جاندار، روح پرور اور ایمان افروز تھی، اور ریڈیو سے پہلی مرتبہ میں اس مقرر کو سن رہا تھا، فوراً میرا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ ہو نہ ہو یہ ایک زبردست روحانی پیشوا اور بڑا دینی واعظ ہے، جو اسلام کی اس قدر حسین وجمیل تصویر اپنی تقریر میں پیش کر رہا ہے، جو دلوں کو کھینچ رہی ہے اور ذہنوں کو گرویدہ بنا رہی ہے، وہ اسی مملکت کے سربراہ تھے، اسی طرح مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے ایک وزیر مملکت اور شاہی خاندان کے ایک عالی مرتبہ فرد کی ایک گفتگو (TALK) سنی تھی، جو اول الذکر سے ان تمام صفات میں کسی طرح کم نہ تھے۔ آپ کانفرنسوں کے اس طویل وعریض سلسلہ کو چھوڑ دیں جو عالم اسلام پر بادلوں کی طرح چھایا ہوا ہے اور جو علماء ومشائخ کی اندرون وبیرون ملک میں آمدورفت کا ذریعہ اور تمام دوسرے عربی ممالک سے (جس کے دروازے اسلام کے لئے بند ہیں) اسلامی عناصر کے ایک جگہ جمع ہوجانے کی تقریب بنتی رہتی ہے، اب اگر کوئی اس موقف سے ذرا بھی ٹکراتا ہے اور اس صدا سے ذرا بھی الجھتا ہے جو مسجد کے ممبر ومحراب اور تخت شاہی سے یکساں طور سے دی جارہی ہے، تو قدرتی طور پر لوگوں کو اس سے استعجاب وحیرانی ہوتی ہے، ان دوسرے مسلم وعرب ملکوں کا یہ مسئلہ نہیں ہے جن کو یا تو اسلامی دعوت وتحریکات سے کوئی سروکار نہیں، یا وہ کھلے طور اور اعلانیہ اسلامی تعلیمات اور ان کے احیاء وترویج کی کوششوں سے برسرپیکار اور ہر وقت آمادۂ جنگ نظر آتے ہیں۔ اور ان کے خلاف سازش اور منصوبہ بندی میں

مصروف رہتے ہیں، ان کی صورت حال واضح ہے۔

لیکن جب ہم اس مقدس ملک میں تضاد وتناقض کے حیرت انگیز مناظر دیکھتے ہیں جس نے دنیا کو زہد وایثار، سادگی وجفاکشی کا سبق دیا، نیز اسے تن آسانی عافیت کوشی، راحت طلبی، تن پروری بلکہ عیش پرستی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہ مغربی تہذیب کی لائی ہوئی بدعتوں بلکہ لعنتوں کا فریفتہ نظر آتا ہے اور وہ ایسے داخلی امراض میں مبتلا ہے جس سے پوری سوسائٹی اور پورا معاشرہ بلکہ پورا اسلامی وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے، تو ہم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں

انچہ می بینم در بیداریست یارب یا بخواب؟

اے جزیرۃ العرب کے پاسبانو! اس کی نئی نسل کے سرپرستو اور نگہبانو! اے تاریخ نو کے معمارو! جب تک تم کو دین اسلام کی دعوت کا دعویٰ رہے گا، جب تک تم کتاب وسنت کے علم بردار بنے رہو گے، اور جب تک تم اسلام کو دستور حیات، نظام زندگی اور اپنے لئے مشعل راہ سمجھتے رہو گے، دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہمارا احتساب تم سے سخت تر ہوگا، کیونکہ جس قدر اس میدان میں تمہاری دعوت وسرگرمیاں تیز رہیں گی اسی قدر ہمارا احتساب اور گرفت سخت ہوگی۔ ہم بار بار بغیر کسی حجاب اور جھجک کے کہتے رہیں گے کہ تمہارے قول وفعل میں تضاد نہ ہونا چاہئے، شہر کی عام زندگی ہو یا گھروں کی خانگی زندگی، اس میں اور تمہارے اقوال میں کوئی تضاد، کوئی ٹکراؤ نہ ہونا چاہئے، سنیما ہالوں، تھیٹروں اور ٹیلی ویژن میں جو چیزیں تمہارے نونہالوں اور جگر گوشوں کو دکھائی جاتی ہیں نہ وہ تمہارے اقوال کے برعکس ہوں نہ اسلامی اقدار کے مخالف۔

آج اسلام کی جس پرجوش طریقہ پر وکالت کی جارہی ہے اور جس اچھوتے انداز سے اس کی طرف دعوت دی جارہی ہے، اور بہ بانگ دہل جس طرح اسلام بلکہ توحید وکتاب وسنت کی طرف بلایا جارہا ہے،..... جس طرح اسلامی سرگرمیوں اور اسلامی تحریکات کی سرپرستی اور پشت پناہی کی جارہی ہے، جس فراخدلی اور فراخ دامانی سے اسلامی لیٹریچر پھیلایا جارہا ہے، جس فیاضی ودریادلی سے وفود بھیجنے، قرآن مجید کے طبع کرانے پر اور حفظ قرآن کے مدارس قائم کرنے پر دولت صرف کی جارہی ہے کیا یہ ہماری موجودہ عیش پرستانہ زندگی سے ہم آہنگ ہے؟ جو عقیدہ وعزم کو کمزور اور جسم وجاں کو بے روح کردے، کیا یہ ہماری پرتعیش زندگی، بے قابو کردینے والے گانے، ہیجان پیدا کرنے والے پوسٹر اور تصویریں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر عریاں مظاہرے اور برہنگی وفواحش کو دعوت دینے والے مناظر ہمارے ان اقوال زریں سے میل کھاتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں! ان میں پورا تضاد وتفاوت پایا جاتا ہے ویسا ہی تضاد وتفاوت جو گلزار اور ترقی

یافتہ شہر،اور پسماندہ دیہات میں ہوتا ہے ،دولت کے جھولے میں جھولنے والے مالداروں اور ٹکڑے ٹکڑے کے محتاج فقیروں میں ہوتا ہے،ان اقوال میں اور اس زندگی میں مکمل تضاد پایا جاتا ہے،مغرب کی تقلید کی یہ امیرانہ زندگی ہر طرح کے قیود اور پابندیوں سے گریزاں زندگی ،عیش کی دلدادہ زندگی ،لذتوں اور لہو ولعب کی شیدا زندگی (جس سے آپ حضرات خود بھی واقف ہیں اور محسوس کرتے ہیں)اس دعوت اور دعوے سے کوئی مطابقت بلکہ مناسبت نہیں رکھتی جس کے آپ حامل ہیں۔

آج جزیرۃ العرب میں دو دھارے بہہ رہے ہیں،ایک اسلامی دھارا اور ایک سیکولر دھارا ، یا پھر دوسری تعبیر میں یہ کہہ لیجئے ایک دھارا جس کی بنیاد عقائد وحقائق پر ہے،دوسرا دھارا جس کی بنیاد مغربی تہذیب وترقیات کی پرستش پر،ایک دھارا ممبر اور اسٹیج سے بہتا ہے اور کتابوں،مقالات،کانفرنسوں ومجلسوں اور اخبارات ومجلّات کی شکل میں گرتا ہے،دوسرے کا تعلق کارزار حیات ،سوسائٹی کے قلب وجگر،تہذیب وتمدن کی گہرائیوں،انسان کی پسندیدہ مشغلہ وذوق (HOBBY) اور جذبات واحساسات سے ہے۔

جب کوئی شخص جمعہ کا خطبہ یا وعظ سنتا ہے تو اس کے ذہن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد کی یاد تازہ ہوجاتی ہے یا وہ حضرت حسن بصری کی مجلس میں ان کی سحر بیانی سے انگشت بدندان اور دم بخود اور دل کے کانوں سے ان کی باتوں کو قلب وجگر میں اتار رہا ہے،لیکن جب وہ ذرا آگے بڑھ کر کسی سنیما ہال میں داخل ہوتا ہے یا کسی قریب کی دوکان پر فحش وعریاں لٹریچر کا مطالعہ کرتا ہے،یا پھر دوست واحباب کے ساتھ ان تھیٹروں میں آتا ہے جو خاص طور سے اسی لئے تیار کئے گئے ہیں یا کسی تجارتی مرکز سے گذرتا ہے اور آرائش وزیبائش کے سامان پر نظر پڑتی ہے۔''میک آپ'' اور بناؤ سنگار کے طریقے اور آلات دیکھتا ہے یا پھر ان فلیٹوں پر نظر جماتا ہے جو جنت ارضی کا سماں دکھا رہے ہیں اور پھولوں کا گلدان بنے ہوئے ہیں اور ان کے نوجوانوں میں حلت وحرمت سے لاپروائی وبے اعتنائی کا معاہدہ کرتا ہے،نئے نئے فیشنوں کے پیچھے مرمٹنے والے نوجوانوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے جو بغیر کسی عقل ودانش اور صبر وتحمل اور ضبط نفس اور قناعت کے اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگے چلے جارہے ہیں تو اس کو امریکہ کے شہروں میں سے کسی شہر کا گمان ہونے لگتا ہے گویا وہ عیش وعشرت میں ڈوبی ہوئی تہذیب کے سایہ میں زندگی بسر کرتا ہے۔

میں نہیں کہتا ہوں کہ آپ اس ''حمام'' میں تنہا اور اکیلے ہیں،دوسرے ممالک میں مصر ولبنان میں اس سے کہیں زیادہ سخت،کہیں زیادہ مضر،کہیں زیادہ مہلک چیزیں پائی جاتی ہیں،لیکن دنیا کے نقشہ میں اے بلدامین ! تیرا جو مقام ہے وہ کسی کو حاصل نہیں ہے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ جس کے آثار پاکستان وافغانستان

اور ایران وترکی (اور یہ سب عجمی ممالک ہیں) میں نمایاں ہو چکے ہیں، جو جگہ اور مرتبہ تجھ کو حاصل ہے اس میں تیرا کوئی حریف نہیں، اس لحاظ سے واجب ہو جاتا ہے کہ تو انقلاب اسلامی اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے دروازے کھول دے، صرف کھول ہی نہ دے (یہ بڑا ظلم ہوگا اگر میں صرف اسی قدر تمنا رکھوں) بلکہ اب تجھ کو خود آگے بڑھ کر اس کی قیادت کرنی چاہئے اور اس مبارک قافلے کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لینی چاہئے ع

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن یہ کام بغیر اس ثقافتی وتہذیبی تضاد کو دور کئے ممکن نہیں، اس تضاد کا دور کرنا اور اس کا ازالہ کرنا ان رکاوٹوں کے دور کرنے سے جو راستوں اور سڑکوں کی تعمیر میں دیو پیکر پہاڑوں اور قوی ہیکل چٹانوں کی شکل میں آتی ہے یا پل بنانے یا اسٹیشن کی تعمیر میں درپیش ہوتی ہیں زیادہ اہم ہے، نہ اس کے مقابلہ میں ان بوسیدہ عمارتوں اور کھنڈرات کی صفائی کا کوئی مسئلہ ہے جو عالی شان عمارتوں کی تعمیر اور نئے طرز کے ہوٹل کے قیام کے لئے ضروری ہے، مسئلہ صرف اس تضاد کے دور کرنے اور ختم کرنے کا ہے، یہ مبارک کوشش اس وقت تک نفع بخش و سود مند نہیں ہو سکتی، جب تک تیرے اندر امراء وحکام اور وہاں کے باشندوں اور فرزندوں میں ایسے لوگ موجود رہیں گے جو قول وعمل کے تضاد اور اندرو باہر کے اختلاف کے مہلک اثرات سے ان کوششوں کو برباد ورائیگاں کرتے رہیں گے، اگر قول وعمل میں تطابق ہو اور اندرو باہر یکساں ہو جائے اور خون وآنسو کی آمیزش سے یہ سرزمین مبارک سیراب ہو جائے تو تھوڑی محنت وہ نتائج برآمد کر سکتی ہے جو وہم وگمان میں بھی نہ آ سکتے تھے۔ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

اسلامی انقلاب اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو کبھی کسی چیز کی اتنی شدید ضرورت نہیں پڑی جتنی آج اس کو اس تضاد اور تناقض کے ملبے کو دور کرنے کی ہے اور دونوں سطحوں سے دور کرنے کی ہے، حکومتی سطح سے بھی اور قومی سطح سے بھی، یہی تشکیل اسلامی کی پہلی شرط ہے، جس کو انقلاب اسلامی سے بھی پہلے آنا چاہئے، کم از کم اس کو انقلاب کے شانہ بشانہ چلنا چاہئے، ہماری امیدیں سعودی عرب اور جزیرۃ العرب سے تو یہ ہیں کہ وہ اس میدان میں قائدانہ کردار ادا کرے اور اس مبارک قافلہ کا (جس میں ایمانی روح بیدار ہو چلی ہے اور دین کی بادِ بہاری کے دل نواز جھونکے دنیا کے مشام جان کو معطر کرنے لگے ہیں) شریک سفر ہو۔ اور اس میں بھی اپنی اولیت وفوقیت ثابت کر دے اور پھر دوسرے ممالک یکے بعد دیگرے آگے بڑھ کر اپنی حیثیت وکردار کے مطابق اس سے حصہ پائیں۔

زبان غیب پکار پکار کر کہہ رہی ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً

(البقرۃ:۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ۔ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لله وَهُوَ مُحْسِنٌ واتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلاً (سورہ نساء ۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے، اور ابراہیمؑ کے دین کا پیرو بھی ہے جو (یکسو) مسلمان تھے اور خدا نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا۔

زخموں سے چور، غموں سے نڈھال افغانستان چیخ چیخ کر آواز دے رہا ہے کہ اے جزیرۃ العرب کے شاہین وشہباز، اے نیستان عرب کے شیرو! آگے بڑھو!

آج پاکستان جو اندرونی وبیرونی (مغربی) دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے اور جس دلدل میں پھنسا ہوا ہے اس کا لاغر ونڈھال جسم زبان حال سے فریاد کناں ہے کہ تمہارے دل وجان اس کی اعانت و فریادرسانی میں فرش راہ ہو، اور قول وعمل کی یکسانی وتطابق کے ساتھ ایک ہوکر اس کی پشت پناہی کی جائے، اس کو دلدل سے نکالا جائے اور دشمنوں کے نرغہ سے نجات دلائی جائے۔ اے قائدین عرب! آج کا نوجوان منتظر ہے تمہاری فاتحانہ یلغار اور شوخی کردار کا، اور اس سوز عشق کا جو اس نارنمرود میں بے خطر کود پڑے، اس کو گل وگلزار بنادے، جو جزیرۃ العرب کو خاکستر کرنے کے لئے بیتاب وبے قرار ہے اور اس کو دنیا کے نقشہ میں وہی مقام ومرتبہ حاصل ہو جو اسے کسی زمانے میں حاصل تھا۔ لیکن اے جزیرۃ العرب! کیا یہ مقام ومرتبہ اس کھلے ہوئے تضاد وتناقض سے حاصل ہوسکتا ہے؟ کیا آج تیرے امکان میں یہ ہے کہ دنیا کو مخاطب کرکے کہہ سکے:

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

کیا آج بھی ممکن ہے کہ تو اپنے کو جان جوکھوں میں ڈال کر خطروں میں کود پڑے اور مصائب وآلام کے گھٹاٹوپ بادلوں کے سائے میں دوڑ جائے اور ہر اس آواز پر لبیک کہے جو اسلام کی حمایت اور دین کی حمیت کے لئے دی جائے اور مستانہ وار اس کے لئے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردے؟ حالانکہ تیرا حال یہ ہے کہ تجھے عشرت کدوں میں داد عیش دینے سے فرصت نہیں، غم وآلام کے تیرے پاس گذر نہیں عمدہ لذیذ کھانوں کو چھوڑنا گوارہ نہیں، پرتکلف اور شاہانہ دعوتوں کو ترک کرنا قبول نہیں، بڑے بڑے ٹھیکوں تجارتوں، جائدادوں اور کمپنیوں سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں، نغمہ وساز اور عود وبخور سے وری نا قابل عمل، جنس نازک اور عقل ناقص کے تابع وغلام بن کر رہنا قابل قبول، اور اس پر علماء کا سکوت (الا ماشاء اللہ) یا صحیح تعبیر میں اونچی اونچی بلڈگوں، بڑبڑی تنخواہوں، عمدہ نرم گدّوں پر آرام کی عادت، ایسے شب وروز جو ہر ذمہ داری

اور الجھن سے دور اور ہر پریشانی اور مصیبت سے آزاد ہے، وفود کی آمد ورفت میں مشغولیت، اور مسلسل اسفار نے کسی مردانہ وقلندرانہ کام کے لئے گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

کام صرف ایک کانفرنس سے دوسری کانفرنس، ایک مجلس سے دوسری مجلس، ایک موضوع سے دوسرے موضوع، ایک گفتگو سے دوسری گفتگو، ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل، انٹر کانٹینٹل [1] سے مریدیان [2] مریدیان سے لندن وسوئزرلینڈ اور لبنان کے عشرت کدوں میں منتقل ہونا رہ گیا تاکہ نہ غور وفکر کی فرصت ملے اور نہ اپنی کمزوریوں پر نظر پڑے، نہ طرز معیشت بدلنے کی فکر ہو، اور نہ ان چیلنجوں کی طرف رخ ہو جو ہمارے دروازوں کو بڑی درشتی اور سختی سے کھٹکھٹا رہے ہیں، تم نے اپنے نونہالوں اور جگر گوشوں کو نئے نئے فیشنوں کا ایسا دلدادہ بنا دیا ہے کہ ان کو عمدہ عمدہ کھانے اور جدید سے جدید لباس کو زیب تن کرنے کے علاوہ اور کوئی فکر دامن گیر نہیں، نہ ان کو انقلابات وحوادث کی کوئی خبر ہے اور نہ خدا کی بھیجی ہوئی نشانیوں اور آیات سے کوئی دلچسپی۔

یہ ایک ایسا تکلیف دہ اور خطرناک تضاد ہے جس کو میں کسی لفظ سے تعبیر نہیں کرسکتا۔ اس کی حیثیت ایک ایسے اسپنج کی ہے جو اب تمام اسلامی کوششوں اور سرگرمیوں کو چوسے لے رہا ہوں۔ جس سخت ومہیب زمانے سے دنیا گذر رہی ہے اسکو دیکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اسلام کے قائدین اس خطرناک ''اسپنج'' سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے جس چیز نے اس وقفہ کو اور نازک بنا دیا ہے جس سے عالم عربی گذر رہا ہے وہ مصر کی جدید سیاست اور اس کا نیا رخ ہے اور ایک ایسی چھلانگ لگائیں گے جس سے وہ تمام خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں جو اپنے سینوں میں لئے ہوئے ان کے فاتح اور غازی آباء واجداد اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ لئے ہوئے اپنے مقبروں میں محوخواب ہیں، اور جس سے شہدائے بدر وحنین، احد وقاسیہ اور یرموک واجنادین کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور راحت پائیں۔

اگر اسلام کی عزت وناموس ہمیں عزیز نہ ہوتا اور ''عربی شہ سواروں'' کی صلاحیت اور فطرت پر اعتماد ویقین نہ ہوتا تو نہ قلم میں یہ جولانی آتی اور زبان میں یہ روانی ہوتی۔ میں اپنی اس تلخ نوائی پر معذرت خواہ ہوں کہ

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی حدی را تیز ترمی خوا ں چو محمل را گراں بینی

---

[1] مکہ مکرمہ کے مضافات (حدود حرم) میں ایک شاندار مغربی طرز کا ہوٹل جو حال میں تعمیر ہوا ہے۔ [2] جدہ کا نو تعمیر ہوٹل جو شادی کی تقریبات کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کا ایک شب کا کرایہ ناقابل قیاس حد تک بڑھا ہوا ہے

علماء کرام ـــــ ملت اسلامیہ کے عوام وخواص ـــــ طلبۂ علم اور دینی وملی کارکنوں ـــــ

کی خدمت میں

الفرقان بکڈپو کا ایک نیا اور بیش قیمت تحفہ

حیاتِ نعمانی

یعنی

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی سوانح حیات

برِصغیر کے نامور اہلِ قلم، آپ کے خلفِ اکبر، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے قلم سے

مارچ ۲۰۱۳ء میں ان شاء اللہ منظر عام پر آرہی ہے

ایک سراپا جہد وعمل اور بابرکت زندگی کے تابندہ نقوش کی تاریخ؛ جن میں ہمارے لئے اور ہماری نسلوں کے لئے رہنمائی ہے، اور علم میں رسوخ، عمل میں اخلاص اور مزاج میں عبدیت وفنائیت کا پیغام۔

۹۲ سال پر پھیلی ایک زندگی جس نے دین وملت کی فکر وخدمت کا ایک یادگار نمونہ چھوڑا، جس میں مثالی خلوص ہی نہیں، جذبۂ صادق ہی نہیں، جرأت واستقامت ہی نہیں، حکمت وتدبر ہے، زمانہ فہمی ہے، ملت کی واقعی قوت وصلاحیت پر نظر ہے اور حقیقت پسندی۔

گذشتہ بیسویں صدی قوموں کے لئے بڑے چیلنج لیکر آئی، برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کو کن کن حالات ومسائل کا سامنا اس صدی میں ہوا؟ ان سے عہدہ براء ہونے کے لئے کیا کیا قابلِ ذکر کاوشیں تاریخ کا حصہ بنیں، ان میں سے بیشتر مناظر اس زندگی کی کہانی میں لپٹے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ یہ اسی تاریخ کا ایک بیش قیمت روشن باب ہے۔

سائز: 20 x 26/8 صفحات: تقریباً سات سو۔ معیاری کاغذ، اعلیٰ عکسی طباعت

قیمت-/Rs.450

خصوصی پیشکش: پیشگی قیمت بھیجنے والوں کو نصف قیمت پر دی جائے گی۔ کم از کم پانچ کتاب منگانے پر اخراجات بھی فری

ناشر الفرقان بکڈپو، 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ 226018، فون: 0522-6535664

حیات نعمانی کے مشتملات کی ایک جھلک

یہ سوانح دو حصوں پر مشتمل ہے

حصۂ اول میں درج ذیل ۱۴ باب قائم کئے گئے ہیں

پہلا باب	وطن سنبھل، اور اسکا علمی مقام، خاندان، پیدائش، تعلیم
دوسرا باب	درس وتدریس اور دین حق کا دفاع (یعنی مناظرانہ معرکوں کی جھلکیاں)
تیسرا باب	الفرقان: اخلاص واستقامت کی یادگار
چوتھا باب	مولانا مودودی سے جماعت اسلامی تک
پانچواں باب	خانقاہ رائے پور سے حضرت مولانا الیاسؒ تک
چھٹا باب	مادرِ علمی دیوبند کی خدمت کا دور- اور ایک منفرد کردار
ساتواں باب	آزادی کے بعد نئے ملی تقاضے اور آپ کا فکری وعملی کردار
اٹھواں باب	معذوری کے بیس ۲۰ سالہ دور اور اس کے سبق آموز احوال
نواں باب	تصنیفات وتالیفات
دسواں باب	بیرون ہند کے اسفار وافادات
گیارہواں باب	ملفوظات، مکتوبات اور خطابات
بارہواں باب	مذاق ومزاح، عادات ومعمولات، ازواج واولاد
تیرہواں باب	بندہ اپنے رب کے بلاوے پر
چودہواں باب	وہ شخصیتیں جن سے خصوصی تعلق رہا

حصۂ دوم

بندگان حق کی یافت	(کن کو دیکھا؟ کیا پایا؟)